سیرت رسول کے عملی پہلو

امام الہند مولاناابوالکلام آزاد

فضائل اخلاق

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

کتاب اللہ کی شہادت

رسول اللہؐ عالم انسانیت کے لیے فضائل و مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ جس وجود مبارک کو پوری اولاد آدم کے لیے قیامت تک اسوہ حسنہ قرار دیا گیا۔ اس کی حیثیت اس کے سوا ہو بھی کیا سکتی تھی؟ اس کا پہلا شاہد قرآن پاک ہے۔

(۱) وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔۴۔ (سورة قلم۔۴)

"(اے پیغمبر) تم اعلیٰ اخلاق پرپیدا ہوئے ہو۔"

(۲) فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

(آل عمران : ۱۵۹)

"(اے پیغمبر) خدا کی یہ بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے۔ کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے ہٹ جاتے (یعنی ان کے دل تمہاری طرف اس طرح نہ کھنچتے جس طرح اب بے اختیار کھنچ رہے ہیں)"۔

(۳) لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ

بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (توبہ: ۱۲۸)

"(مسلمانو) تمہارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے، جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بھوکا ہے۔ مومنوں کے لیے نہایت شفیق و رحیم ہے"۔

حضور ﷺ کے ارشادات

حضور ﷺ کے ارشادات ملاحظہ ہوں :

بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔

"میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں ۔"

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

"میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کا معاملہ درجہءاتمام پر پہنچا دوں "۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی تھی تو انھوں نے اپنے بھائی کو تحقیق احوال کے لیے مکہ مکرمہ بھیج دیا تھا۔ بھائی نے مکہ مکرمہ سے مراجعت پر ابوذر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں اطلاع دی:

رایتہٗ یامر بمکارم الاخلاق[1]

"میں نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے ۔ آپ ﷺ اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے ہیں ۔"

یہ بعثت کے بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ اس دور میں بھی جس کسی کی نظر آپ ﷺ پر

---

[1] بخاری کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخا

پڑی ، آپ ﷺ میں جو نمایا ں ترین وصف نظر آیا ، اسے فضائل اخلاق ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان

امام حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کے اخلاق و عادات کے متعلق سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

آپ ﷺ خندہ جبیں ، نرم خو اور مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگدل نہ تھے۔کوئی برا کلمہ کبھی منہ سے نہ نکلا۔عیب جوُ اور تنگ گیر نہ تھے۔ کوئی بات نا پسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے۔اپنے نفس سے آپ نے تین چیزیں بالکل دور کردی تھیں :(الف)بحث و مباحثہ، (ب) ضرورت سے زیادہ بات کرنا(ج)جو بات مطلب کی نہ ہو،اس میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین ہی باتوں سے پرہیز کرتے تھے:(الف) کسی کو برا نہیں کہتے تھے (ب) کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے(ج) کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وہی باتیں کرتے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا۔ آپ ﷺ کلام کرتے تو صحابہ اس طرح سر جھکا کر اور خاموش ہوکر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں ۔ جب آپ ﷺ خاموش ہوجاتے تو پھر (صحابہ) آپس میں بات چیت کرتے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک ختم نہ کرلیتا آپ ﷺ چپ سنا کرتے۔لوگ جن باتوں پر ہنستے، آپ ﷺ محض مسکرادیتے۔ باہر کا کوئی آدمی (یعنی اجنبی) بے باکی سے گفتگو کرتا تو

آپ ﷺ تحمل فرماتے۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے تا ہم اگرکوئی آپ ﷺ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرمالیتے۔ جب تک بولنے والا چپ نہیں ہوجاتا تھا، آپ ﷺ اس کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی آپ ﷺ کو دفعتہ دیکھ لیتا تو مرعوب ہوجاتا۔ لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتامحبت کرنے لگتا[۵] اور کہا کرتا کہ میں نے آپ ﷺ جیسا کوئی بھی اس سے پہلے یا بعد میں نہیں دیکھا۔یہ محض عہد نبوت کے تئیس برس ہی نہیں بلکہ چند سال پیشتر کے عینی مشاہدات کابھی جامع مرقع ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعض اہم واقعات بھی دیکھے تھے اور مدنی زندگی میں تو وہ حضور ﷺ کی رفیقہ حیات بن گئی تھیں ۔ یہاں تک کہ اس دنیا میں حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا آخری ہفتہ حضرت ممدوحہ ہی کے حجرہ میں گزرا۔ حضرت ممدوحہ رضی اللہ عنہا نے سہارا دے رکھا تھا، جب روح پاک اس دنیا کو چھوڑ کر عالم قدس میں پہنچی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے حجرہ کو اللہ تعالیٰ نے جسد اطہر کی آخری آرام گاہ بنایا۔ مشاہدہ

---

۵ سیرت النبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۸۸-۲۸۹ بحوالہ شمائل ترمذی

کہ جیسے مختلف مواقع حضرت ممدوحہ رضی اللہ عنہا کو میسر آئے، وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوسکتے تھے۔آپ کے بعض ارشادات ملاحظہ ہوں :

١۔ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ان میں سے وہ لے لیتے جو آسان اور سہل ہوتی، بشرطیکہ اس میں گناہ کا کوئی پہلو نہ ہوتا، اگر گناہ ہوتا تو آپ ﷺ سب سے بڑھ کر اس سے دوری اختیار کرتے۔❷

٢۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی کو سزا نہ دی اور کبھی بدلہ نہ لیا، ہاں اللہ کے حکموں کی حرمت زایل کرنے والوں کو آپ ﷺ اللہ کے لیے سزا دیتے تھے۔❸

٣۔ عادت شریف یہ تھی کہ برائی کے بدلے میں برائی سے کبھی کام نہ لیا، ہمیشہ درگزر کرتے اور معاف فرمادیتے۔❹

۴۔ رسول اللہ ﷺ اس طرح کبھی نہ ہنسے کہ آپ ﷺ کا تالو نظر آیا ہو، صرف مسکرادیا کرتے تھے۔

۵۔ ہر لحظہ دل پر خوف و خشیت الٰہی کا غلبہ رہتا تھا، بادل دیکھتے یا آندھی آتی تو چہرہ مبارک پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوجاتے۔ میں نے (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے) کہا:یا رسول اللہ! لوگ باد ل دیکھتے ہیں تو اس امید پر

---

❷ صحیح بخاری، کتاب المناقب
❸ سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۸۷
❹ سیرۃالنبی جلد اول حصہ دوم ص ۲۸۷

خوش ہوتے ہیں کہ بارش ہوگی۔ آپ ﷺ کے
چہرے سے تکلیف نمایاں ہوتی ہے۔ فرمایا:
عائشہ! کون سی بات مجھے بے خوف کر
سکتی ہے کہ اس میں عذاب نہ ہوگا؟ ایک
قوم کو آندھی سے عذاب دیا گیا۔ ایک قوم نے
عذاب دیکھا تو کہا یہ بادل ہے۔❶

۶۔ آپ ﷺ نے نام لے کر کبھی کسی پر لعنت نہ کی،
نہ کبھی اپنے کسی خادم ، کسی لونڈی، کسی
غلام ، کسی عورت اور کسی جانور کو اپنے
ہاتھ سے مارا۔❷

۷۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کی درخواست رد نہ
فرمائی، اِلا یہ کہ وہ ناجائز تھی۔

۸۔ گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے،
باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے کہ کوئی
یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔❸

۹۔ ایک بدوی آیا اور بولا آپ بچوں کو بوسہ دیتے
ہیں ہم تو بوسہ نہیں دیتے، فرمایا: اللہ نے
تیرے دل سے رحم نکال دیا، اس میں میرا کیا
اختیار ہے؟❹

۱۰۔ اسود رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں کیا کیا
کرتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:
گھر والوں کی خدمت میں رہتے تھے یعنی ان

---

❶ صحیح بخاری
❷ سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۳۸۷ بحوالہ مسلم و ابوداؤد۔
❸ بخاری کتاب الادب۔
❹ بخاری،کتاب الادب

کے کام کیا کرتے تھے ، نماز کا وقت آتا تو نماز کے لیے چلے جاتے۔[5]

۱۱۔ اگر کسی کی کوئی حرکت پسند نہ ہوتی تو اس کا نام لے کر منع نہ فرماتے،اصل فعل کو منع فرمادیتے۔

۱۲۔ رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں نے ایک دن میں دونوالے نہیں کھائے،مگر ان میں سے ایک کھجور کاتھا۔[6]

اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے خادم انس رضی اللہ عنہ بن مالک کا یہ بیان بھی شامل کر لیجیے کہ میں نے دس سال آپ ﷺ کی خدمت میں گزارے، اس پوری مدت میں آپ ﷺ میرے متعلق نا پسندکا کوئی کلمہ زبان پر نہ لائے۔ نہ کبھی یہ فرمایا:فلاں کام کیوں کیا؟ نہ کبھی یہ فرمایا: فلاں کام کیوں نہ کیا؟ [7]

نبوت سے پیشتر کی زندگی

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیانات کا تعلق زیادہ تر عہد نبوت سے ہے جس کی کل مدتئیس سال تھی۔ اس سے پیشتر آپ چالیس سال کی طویل مدت گزار چکے تھے۔ یہی زندگی ہے جسے قرآن مجید میں ایک مقام پر صداقت نبوت کی ایک قوی دلیل قرار دیا گیا ہے یعنی!

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

(یونس:۱۶)

---

[5] بخاری ، کتاب الصلوٰۃ باب اذادعی الامام الی الصلوٰۃ۔

[6] صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔

[7] بخاری، کتاب الادب۔

”یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ (یعنی نبوت) سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں ، کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں ہو“

مشرکین عرب کو رسول اللہ ﷺکی صداقت و فضیلت سے انکار نہ تھا، حتیٰ کہ ابوجہل کو بھی اعتراف تھا کہ آپ ﷺسچّے ہیں ، مگر وہ کہتے تھے کہ آپ ﷺایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں ہم قبول نہیں کرسکتے۔ اوپر کی آیت میں صداقت نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے۔ یعنی فرمایا:

“ساری باتیں چھوڑ دو، ایسی بات پر غور کروکہ میں تم میں نیا آدمی نہیں ، جس کے خصائل وحالات کی تمہیں خبر نہ ہو ۔ تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں ۔ یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ اس میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور دیانت کے خلاف دیکھی؟پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہوسکا کہ انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا اب ایسا ہوسکتا ہے کہ خدا پر بہتان باندھنے کیلئے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں ، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی چھوٹی سی بات بھی تم نہیں سمجھ پاسکتے؟

تمام علماءِ اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ

انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے۔ جو سانچا اس عرصہ میں بن گیا بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا ۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں ہی پر نہیں ، فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (الانعام۔ ۱۴)پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ بعد میں فرمایا: دو باتوں سے تم انکار نہیں کرسکتے کہ جو شخص اللہ پر افترا کرے، اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے۔ اور شریر مفتری کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہوگیا۔ جو مکذب تھے، ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا، اس کا کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا ۔[5]

دنیا جانتی ہے کہ جس دور میں سچائی اور دیانت و امانت کی روشنی گل ہوچکی تھی، اس دور میں رسول اللہ ﷺ نے سیرۃ طیبہ کی پاکیزگی اور طہارت سے "الصادق اور الامین" کے لقب حاصل کیے۔ جب حرم کعبہ کی تعمیر کے سلسلہ میں حجراسود کو اصل مقام پر نصب کرنے کے

---

[5] ترجمان القرآن جلد دوم ص ۱۵۱۔ ۱۵۲۔

متعلق رؤساءقبائل کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی تو فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے، اسے ثالث بنا لیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے آئے اور تمام لوگ پکار اٹھے: "امین آگئے" ، "امین آگئے"، ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہے۔یہ حضور ﷺکی سیرت کے متعلق ایک ایسی گواہی تھی، جس کی صداقت و محکمیت سے کسی کے لیے بھی اختلاف بجانہ ہوگا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شہادت

محض یہی نہیں ، ایک نہایت زبر دست شہادت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ہے ، جو بعثت تک پندرہ سال رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں گزار چکی تھیں ، اس کے بعد دین حق کے دور غربت کی اذیتیں اور مصیبتیں بھی دس سال تک صابرانہ برداشت کرکے عالم بقا کو سدھاریں ، یہ شہادت بھی عہد بعثت سے ہی نہیں بلکہ بعثت سے پیشتر ہی کی زندگی سے متعلق ہے۔

سورہ علق کی آیتیں آپ ﷺ پر نازل ہو چکیں تو اول نزول وحی کی شدت کا آپ ﷺ پر بے حد اثر تھا اور یہ پہلی وحی تھی، معلوم ہے کہ اس کے بعد بھی جب وحی نازل ہوتی تھی تو چہرہ مبارک پر پسینہ کے قطرے نمودار ہوجاتے تھے۔ دوم جو گر اں قدر کام اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذمہ لگادیا تھا، اس کی بے پناہ مشکلات کا آپ ﷺ کو پورا اندازہ تھا، اس لیے آپ ﷺ و ﷺ حرا سے اتر کر

گھر تشریف لائے تو قلب مبارک پر لرزہ سا طاری تھا۔ جب طبیعت ذرا سکون پذیر ہوئی توآپ ﷺ نے پوری کیفیت غمخوار و غمگسار ر فیقہ حیات کو سنا کر فرمایا: لقد خشیت علیٰ نفسی(مجھے اپنی جان کا خوف ہے)۔ حضرت خدیجہ ضاللہعنہا رسول اللہ ﷺ کی نہایت پاکیزہ اور سراپا خیر طریق حیات سے پوری طرح آگاہ تھیں ۔ انہیں خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ خلق خدا کے ساتھ محبت وشفقت کے ایسے نادر پیکر کو قدرت کامیابی کی منزل پر نہ پہنچائے گی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

”ہرگز نہیں ،خدا کی قسم، خدا آپ ﷺ کو کبھی اندوہ گیں نہ کرے گا۔ آپ ﷺ عزیزوں اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں ، ناتوانوں ، بیکسوں اور غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں ، جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا، انہیں دیتے ہیں ، مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں ، مصائب میں حق کے معاون و مددگار ہیں ، [1]صادق القول ہیں ۔ “[2]

یہ شہادت ان فضائل و مکارم کے متعلق ہے۔ جو بعثت سے پیشتر وجودگرامی میں موجو د تھے اور حضرت خدیجہ ؓ سے بڑھ کر ان کا انداز شناس کون ہوسکتا تھا؟

---

[1] کیف کان بدالوحی

[2] یہ ٹکڑا اسی حدیث کی روایت میں آیا ہے۔ جو بخاری کی کتاب التعبیر میں آئی ہے۔

اہل ایمان کے اوصاف و خصائل

رسول اللہ ﷺ کے فضائل اخلاق کا اندازہ کرنے کے لیے ایک معیار یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہل ایمان کے جو اوصاف و خصائل قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں انہیں سامنے رکھ لیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس وجود مبارک کے ذریعے سے قرآن مجید کی تعلیم مخلوق تک پہنچائی، وہ بہر حال اس تعلیم کا ایک مقدس پیکر ہوگا۔ اسی وجود مبارک کو دیکھ کر صحابہ اپنے عمل درست کرتے تھے اور اسی وجود مبارک کے زیر سایہ ان کے تزکیے کا سلسلہ جاری تھا۔

قرآ ن مجید سے وہ تمام آیتیں اس مختصر مضمون میں چن کر جمع کردینا ممکن نہیں ، لیکن ان میں سے چند ملاحظہ فرمالیجیے، جن میں مجلسی، اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے او صاف کا ذکر ہے:

١۔ مومن وہ ہیں جو اللہ سے ڈرتے اور باہمی معاملات درست رکھتے ہیں ۔ اللہ کا ذکر چھڑے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں ۔ اللہ کا کلام سنایا جائے تو ان کے ایمان زیادہ ہوجاتے ہیں ۔ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں ۔نماز پڑھتے ہیں ،جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہے ،اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہی حقیقی مومن ہیں (انفال:١۔٤)

٢۔ بلاشبہ ایمان والے کامیاب ہوئے (ان کی خصوصیتیں کیا ہیں ؟) نمازیں خشوع و خضوع سے ادا کرتے ہیں ۔ نکمی اور لغو باتوں

سے رُخ پھیرے ہوئے ہیں ۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں ۔ عفت و عصمت کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں ہوتے امانتوں اور وعدوں کا انہیں پاس رہتا ہے۔ نمازوں کی حفاظت میں بھی کوتاہی نہیں کرتے۔ (مومنون:۱ – ۱۰)

۳۔ اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں یعنی عجز و فروتنی سے چلتے ہیں ۔ جب جاہل یعنی کم عقل ، اکھڑ اور بے ادب لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو ملایم بات سنا کر اور صاحب سلامت کہہ کر الگ ہوجاتے ہیں ۔ رات کا وقت (یعنی سونے کا وقت کلب کی تفریحات میں نہیں) اپنے پروردگار کے لیے قیام اور سجود میں گزارتے ہیں اور کہتے ہیں : اے ہمارے پروردگار! ہم سے دوزخ کا عذاب پھیردے جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ موقع کی مناسبت کے پیش نظر تنگی کرتے ہیں ۔ وہ کسی کا بے گناہ خون نہیں بہاتے جس سے اللہ نے منع کر رکھا ہے۔ اور بدکاری سے بھی دور رہتے ہیں جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے۔ کسی کی لغوبات سے گزر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں ۔(فرقان: ۶۳-۷۴)

۴۔ ”وہ (اہل ایمان)پر وردگار پر بھروسے رکھتے ہیں ، بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے دور رہتے ہیں ۔ جب غصّہ آئے تو معاف کردیتے ہیں اور خدانے انہیں جو کچھ دے رکھا

ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۔ جب ان پر کوئی زیادتی ہوتو بدلالیتے ہیں ، برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پھر جو کوئی معاف کردے اور نیکی کرے، اس کا ثواب اللہ کے ذمّہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ، جو کوئی مظلوم ہوکر بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ۔ ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں ، ان کے لئے دردناک عذاب ہے اور جو ظلم سہے جائے اورمعاف کر دے تو یہ بڑی اعلیٰ ہمتی کے کاموں میں سے ہے”۔ (شوریٰ ۴۳:۳۶)

اصل نیکی

اصل نیکی کیا ہے؟

۱۔ اللہ پر ایمان ۔

۲۔ یوم آخرت اور فرشتوں پر ایمان۔

۳۔ خدا کی اتاری ہوئی کتابوں اور خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان ۔

۴۔ خدا کی محبت میں اپنا مال رشتے داروں ، یتیموں ، مسکینوں اور مانگنے والوں کو دینا۔

۵۔ مال خرچ کرکے غلاموں کو آزادی دلانا۔

۶۔ نماز اور زکواۃ باقائدے ادا کرتے رہنا۔

۷۔ عہد کرلینا تو اسے بہر حال پورا کرنا۔

۸۔ تنگی، مصیبت یا خوف و ہراس میں صابر و ثابت قدم رہنا۔(بقرہ : ۱۷۷)

نیز فرمایا:

۱۔ خوش حالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں خدا کے لیے خرچ کرنا۔
۲۔ غصّے کو پی جانا اور لوگوں کے قصور معاف کردینا۔

یہ دعوت حق کی محض چند جھلکیاں ہیں جنھیں ان پر عمل کرنے والوں کی شکل میں بھی پیش کیا گیا اور محض نیکیوں کی شکل میں بھی ۔ کیا کسی کے لیے یہ تصور کرلینا مشکل ہے کہ جس داعی حق کو یہ پاک دعوت دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا، وہ خود اپنی مقدس تعلیم کا کتنا افضل و اعلیٰ اور کس درجہ منورو مزکّی نمونہ ہوگا۔

حسنِ اخلاق کی اہمیت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں ۔
۲۔ کامل ایمان اس مومن کا ہے ، جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔
۳۔ قیامت کے روز اعمال کی ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری چیز کوئی نہ ہوگی۔
۴۔ انسانوں کو قدرت کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں ان میں سب سے بہتر چیز اچھے اخلاق ہیں ۔
۵۔ بندوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں ۔
۶۔ آخرت کی زندگی میں میرے لیے سب سے

پسندیدہ وہ شخص ہوگا جس کے اخلاق اچھے ہوں اور وہی مجھ سے قریب تر ہوگا۔❶

٧۔ کسی نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ مومنو ں میں سے افضل کون ہے ؟ فرمایا: "احسنھم خلقا"(جو سب سے زیادہ خوش اخلاق ہو) ❷

٨۔ انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ حاصل کرسکتا ہے، جو مسلسل روزے رکھنے اور راتوں کو مسلسل عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

آخری ارشاد کے سلسلہ میں اتنا عرض کردینا چاہیے کہ یہ ایک اسلوب بیان ہے، جس میں حسن اخلاق کو اس درجے پر رکھ کر پیش کیا گیا ہے جو نماز اور روزے جیسی نفلی عبادات سے حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص فضائل اخلاق کے ساتھ نفلی عبادت میں بھی سرگرم رہے گا، اس کا درجہ اور بھی بلند ہوگا۔

غرض ان ارشادات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فضائل اخلاق کو دین حق میں کتنا بلند درجہ حاصل ہے اور ہونا بھی چاہئیے ، کیونکہ اخلاق درست ہوں گے تو افراد و جماعات میں میل جول بڑھے گا، ان میں محبت وہمدردی کو فروغ حاصل ہوگا۔

ایک دوسرے کے نفع و نقصان اور دکھ سکھ کا احساس ترقی کرے گا، کش مکش کے اسباب رفتہ رفتہ زائل ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ پورا مجمع انسانیت ایک کنبے کے افراد اور ایک خاندان

---

❶ سیرۃ النبی جلد ششم ص ٢٠۔٢٢

❷ سیرۃ ابن ہشام، القسم الثانی ص ٣٦١۔

کے اعضا کی حیثیت میں رہنے سہنے لگے گا، ہر
قلب میں احترام آدمیت کو صحیح مقام مل جائے
گا۔ یہی اسلام کا اصل نصب العین تھا۔اس کی
طرف پیش قدمی جاری تھی کہ اچانک ملوکیتوں
اور بادشاہیوں کا دور شروع ہوگیا، جس کی
ظلمت و تیرگی میں قافلۂ اسلام کی ہر متاعِ
عزیزگم ہوگئی اور اب کسی بھی چیز کا ٹھیک
ٹھیک سراغ لگالینا خاصا مشکل ہوگیا ہے۔ اگر
کسی کا سراغ مل بھی جائے تو ہم لوگوں کے
ذہنوں میں دور ملوکیت کے وقت سے دین حق کا
جو نقشہ جما ہوا ہے، اس میں کسی بازیافتہ
شے کے لیے موزوں جگہ نکالنا بظاہر آسان نہ
ہوگا۔

باقی رہی تبلیغ اسلام تو وہ ہر مسلمان کے
لئے فرداً اور ہر اسلامی جماعت کے لئے
اجتماعاً اس دنیا میں اولین شے ہے، نہ محض اس
لیے کہ اسلام اور حق کو پھیلانا ہر فرد و جماعت
کے لیے بہترین سعادت ہے، اس لیے بھی کہ ہم
جنسوں کی پُر خلوص بہی خواہی ہر مسلمان
کے اہم فرائض میں داخل ہے اور تمام ہم
جنسوں کو نعمت اسلام کا حامل بنادینے سے بڑھ
کر بہی خواہی کوئی نہیں ہو سکتی ، جس پر
دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و بہبود موقوف
ہے۔ لیکن تبلیغ اسلام کے لیے بھی سازگار فضا
صلح و امن ہی سے میسر آسکتی ہے؛ اگر نفرت
و مخالفت کی آگ دلوں میں بھڑک رہی ہو تو
کسی کو پیغام حق سنانے کی کیا صورت ہوگی؟

سیرۃ طیبہ سے ظاہر ہے کہ بدر و حنین کی فتوحات بے شائبہ ریب بہت عظیم القدر تھیں تاہم فتح مبین صلح حدیبیہ ہی قرار پائی، جس نے طول و عرض عرب میں دلوں کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیے اور "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا روح افروز منظر سب نے دیکھ لیا۔

ایمان کیا ہے؟

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں سے صرف چند حدیثیں یہاں درج کی جاتی ہیں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ ایمان و اسلام حقیقۃً کیا ہیں ؟ مثلاً:

۱۔ مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان کو کوئی گزندنہ پہنچے اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی ہر شے ترک کردے۔

۲۔ اس وقت تک کوئی شخص حقیقۃً مومن نہیں ہوسکتا ، جب تک اپنے مومن بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں ، اس نے ایمان کی حلاوت پالی۔

الف۔ اللہ اور رسول ﷺ اس کے نزدیک ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں ۔

ب۔ ہر فردکے ساتھ صرف اللہ کے لیے محبت کرے یعنی محبت کے ساتھ کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔

ج۔ کفر کی طرف لوٹ جانا اسے اتنا ہی بُرا معلوم ہو ، جتنا آگ میں ڈالا جانا۔

۴۔ تین باتیں ہیں ، جس نے یہ جمع کرلیں ، اس نے ایمان جمع کرلیا۔

الف۔ اپنے نفس کے مقابلے میں بھی انصاف پرقائم و استوار رہنا۔

ب۔دنیا میں سلامتی اور حق پھیلانا۔

ج۔ تنگ دستی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

۵۔ حضور ﷺ سے پُوچھا گیا کہ کون سا اسلام بہتر (خیر) ہے؟ فرمایا: کھانا کھلانا اور سب کو سلام کہنا یعنی سلامتی کی دُعا دینا ، خواہ جان پہچان ہویانہ ہو۔

۶۔ خود ابوذررضی اللہ عنہ غفاری کی روایت ہے کہ میں نے غلام کو گالی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے سُن لی اور فرمایا: ابوذررضی اللہ عنہ ابھی تم میں جاہلیت باقی ہے، غلام تمہارے بھائی ہیں ، اللہ نے انہیں تمہارے ماتحت کردیا ہے، جس کا بھائی ماتحت ہو، اسے چاہیے بھائی کو ویساہی کھلائے جیسا آپ کھائے ، ویسا ہی پہنائے جیسا آپ پہنے اور بھائی سے ایسا کام نہ لے، جو اس سے نہ ہوسکے، کوئی سخت کام ہو تو خود اس کی مدد کرے۔

۷۔ جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ وہ درست ہوتو سارا جسم درست رہتا ہے، وہ بگڑجائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے، سنو ، وہ دل ہے۔

۸۔ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔

۹۔ جب دو مسلمان تلواروں کے ساتھ مقابلے پر آئیں تو قاتل و مقتول دونوں آگ میں ہوں گے۔ عرض کیا گیا : کہ قاتل تو ہو ا مگر مقتول کا یہ حال کیوں ہوگا؟ فرمایا : وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنا چاہتا تھا(لیکن موقع نہ پاسکا اور خود ماراگیا)۔

۱۰۔ جس میں چار باتیں ہوں ، وہ خالص منافق ہے:

الف۔ امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

ب۔بات کہے تو جھوٹ بولے۔

ج۔ عہدکرے تو اسے پورانہ کرے۔

د۔ جھگڑے تو ناحق کی طرف چلاجائے۔

ان میں سے کوئی بھی بات کسی میں ہوتو نفاق کی علامت ہوگی تا آنکہ وہ اسے ترک کردے۔

۱۱۔ خدا کے نزدیک پسندیدہ عمل وہ ہے، جس پر مداومت کی جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔

۱۲۔ ”کتاب الادب“ میں ہے کہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا:

خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا۔ عرض کیا: کو ن یارسول اللہ ﷺ ؟

فرمایا :جس کا پڑوسی اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔

ان ارشادات پر غور فرمایئے اور اندازہ کیجئے

کہ رسول اللہ ﷺ نے عالم انسانیت کو کس راستے پر چلنے کی دعوت دی؟

آیا اس کے سوا امن عالم اور بہبودِ انسانیت کا کوئی راستہ ہوسکتا ہے؟ ساتھ ہی سوچئے کہ جس سر چشمہ فلاح و صلاح کونین سے یہ اور ایسی ہزاروں موجیں اٹھیں ، اس کے طیب و طاہر ہونے کا درجہ کتنا بلند ہوگا۔

دائر اصلاح و درستی

قرآن پاک اور سنت رسول ﷺ میں جو کچھ بصورت امر یا بہ شکل نہی آگیا ہے، اس میں انسانی زندگی کا کوئی بھی ضروری گوشہ نظر انداز نہیں ہوا۔ خطبہ حج میں رسول اللہ ﷺ نے تین چیزوں کا ذکر بطور خاص فرمایا تھا ، یعنی جان ، مال اور آبرو ، پھر حج کے دن ، حج کے مہینے اور مکہ مکرمہ کی حرمت کی طرح جان ، مال اور آبرو کی عزت و حرمت کی تاکید فرمائی تھی۔ غور کیا جائے ، تو دنیا میں جتنی زیادتیاں ، جتنے ظلم اور جتنے گناہ ہیں ، ان میں سے بیشتر کا تعلق اصلاً انھی تین چیزوں میں سے کسی ایک سے نکلے گا جو ہر انسان کو فطرۃً عزیز ہیں ۔ کتاب و سنت کی محو لہ بالا تعلیمات میں کوئی چیز ایسی نہیں ملے گی ، جو ضرور ی تھی اور اس کے کرنے یا نہ کرنے کی تاکیدنہ آئی ہو۔

حُسن خلق

رسول اللہ ﷺ نہایت نرم مزاج اور خوش اخلاق تھے، چہرہ مبارک پر اس قسم کی کیفیت چھائی رہتی تھی جس سے دیکھنے والے پر لطف و شفقت کا اثر پڑتا۔ گفتگو وقار و متانت سے فرماتے ، ایک ایک جملہ ٹھہرٹھہر کر بولتے، ہر ایک کو نرمی سے سمجھاتے،کبھی کسی کی دل شکنی گوارا نہ فرمائی، آپ سوار ہوتے اور راستے میں کوئی صحابی مل جاتا تو اسے سوار کرادیتے اور خود اتر آتے ۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلاجاتا تو ڈھیلے مار مار کر کھجور یں گراتا، لوگ مجھے پکڑ کر خدمت اقدس میں لے گئے، آپ ﷺ نے فرمایاکہ زمین پر ٹپکی ہوئی کھجور کھالیا کرو، ڈھیلے نہ مارا کرو ، پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔

ایک مرتبہ حالتِ قحط میں ایک صاحب نے باغ سے کھجور کے خوشے توڑ کر کھائے اور کچھ دامن میں رکھ لیے،باغ کے مالک نے اسے مارا اور کپڑے اتروالیے، پھر شکایت لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں پہنچا، کھجور یں توڑنے والا بھی ساتھ تھا، آپ ﷺ نے مالک باغ سے کہا ، یہ جاہل تھا ، اسے تعلیم دینی چاہیے تھی، بھوکا تھا، کھانا کھلانا چاہیے تھا،یہ فرماکر کپڑے واپس دلائے اور اسے ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے دیا، جو ہمارے حساب سے تین من ، تیرہ سیر اور دو چھٹانک ہوتا ہے۔

مجلس نبوی میں بیٹھنے کی جگہ نہ رہتی تو نئے آنے والے کے لیے ردائے مبارک بچھا دیتے تھے۔

سلام میں پیش دستی فرماتے ۔ راستے چلتے تو مرد، عورت، بچے جو سامنے آتا اسے سلام کرتے ۔ زبان مبارک پر کبھی کوئی غیر مناسب لفظ نہ آیا۔ انس ضی اللہ عنہ بن مالک کہتے ہیں کہ جب ، کسی پر عتاب کرتے تو فرماتے: "مالَہ تَرِب جبینہ" اسے کیا ہوا ، اس کی پیشانی خاک آلود ہو)[1] محاورے میں اس فقرے کا استعمال ہلکے زجر کے رنگ میں ہوتا ہے۔

بچوں پر شفقت

حضورﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتےتھے آپ ﷺ سفر سے تشریف لاتے اور لوگ استقبال کے لیے نکلتے تو بچے بھی ساتھ ہوتے اور وہ معمول کے مطابق دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے،جو پہلے پہنچتے انہیں آپ ﷺساتھ سواری پر بٹھا لیتے۔ راستے میں مل جاتے تو انھیں خود سلام کرتے اور ان سے بھی شفقت کا یہی برتاؤہوتا۔

ایک مرتبہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہ ضی اللہ عنہا کے پاس آئی ۔ اس کی دو بچیاں بھی ساتھ تھیں ۔ اتفاق سے حضرت عائشہ ضی اللہ عنہا کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا ۔ ایک کھجور پڑی تھی وہ اس عورت کو نذر کر دی۔ اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ایک ٹکڑا دونوں کو دے دیا۔حضرت عائشہ ضی اللہ عنہا کے یہ واقعہ رسول اللہﷺ کوسنایا تو فرمایا: جس کے

---

[1] بخاری : کتاب الادب۔

دل میں خدا اولاد کی محبت ڈالے اور وہ اس محبت کا حق ادا کرے تو دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

یہ شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں چند بچے بھی بہ ارادہ و علم مارے گئے، آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو بڑا رنج ہوا۔ کسی کی زبان سے نکلا یا رسول اللہ ﷺ وہ مشرکین کے بچے تھے۔ فرمایا:مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں ۔خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان خدا ہی کی فطرت پرپیدا ہوتی ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ بن سمرہ صحابی اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی پھر آپ ﷺ کے ساتھ ہولیا۔ سامنے سے چند اور بچے آگئے۔آپ ﷺ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔

غلاموں پر شفقت

اوپر گزرچکا ہے،ابوذر رضی اللہ عنہ غفاری سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں ‘ جو خود کھاؤ،انہیں کھلاؤ،جو خود پہنو، انہیں پہناؤ۔چنانچہ اس کے بعد سے ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو ہمیشہ کھانے پہننے وغیرہ میں اپنے برابر رکھا۔

غلاموں کے لئے لفظ غلام بھی گوارا نہ تھا ۔ آپ ﷺ نے فرمایا:انہیں غلام یا لونڈی کہہ کر نہ پکارا کرو۔ "میرا بچہ" "میری بچی" کہا کرو۔آپ ﷺ کے پاس جو غلام آتا،اسے آزاد کر دیتے۔لیکن وہ

لوگ آزاد ہوکر بھی آپ ﷺ کی شفقت کی زنجیر میں جکڑے رہتے۔ زید رضی اللہ عنہ بن حارث کا واقعہ محتاج تفصیل نہیں ۔ ان کے والد اور چچا لینے کے لیے آئے اور ہر قیمت ادا کرنے کے لئے آمادہ تھے۔ آپ ﷺ پہلے ہی زید رضی اللہ عنہ کو آزاد کر چکے تھے۔ جانے نہ جانے کا معاملہ زید رضی اللہ عنہ ہی پر چھوڑ دیا۔اس نے جانے سے انکار کردیااور آپ ﷺ کے آستانہ رحمت کو والدین اور دوسرے خونی اقربا کے ظل عاطفت پر ترجیح دی[۱]۔ محبت و شفقت کے اس اعجازکا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے، جس کے سامنے قریب ترین خونی رشتے بھی بے حقیقت رہ گئے تھے؟ زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کو جتنی محبت تھی، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ بعض نہایت اہم معاملات میں اسامہ رضی اللہ عنہ ہی کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں سفارشی بنایا جاتا تھا اور فتح مکہ میں داخلے کے وقت اسامہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ردیف تھے۔

ایک صحابی اپنے غلام کو مار رہے تھے ۔پیچھے سے آواز آئی کہ خدا کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے۔ صحابی نے مڑ کر دیکھا تو خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺمیں نے اسے لوجہ اللہ آزاد کر دیا ۔فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تمہیں چھو لیتی۔

سب سے آخری وصایا میں سے ایک وصیت یہ تھی کہ غلاموں اور لونڈیوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرتے رہنا۔ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ غلاموں کا قصور کتنی مرتبہ معاف

---

۱ سیرة النبی جلد اول حصہ دوم ص ۳۸۲۔

کروں ؟ آپ ﷺ خاموش رہے۔ جب تیسری مرتبہ یہی گزارش کی تو فرمایا: "ہر روز ستر مرتبہ"۔

غریبوں پر شفقت

رسول اللہ ﷺ اکثر دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا یہ کیوں ؟ فرمایا:اس لیئے کہ مساکین دولتمندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔پھر فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا!کسی مسکین کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ کچھ نہ ہو تو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی سہی،ضرور دو۔ عائشہ رضی اللہ عنہا غریبوں سے محبت کرو۔ انہیں اپنے سے نزدیک رکھو،خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمروبن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں مسجد میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف فقرائے مہاجرین کا حلقہ تھا ۔رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس حلقے میں بیٹھ گئے۔میں بھی وہیں جا بیٹھا۔فرمایا:فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولتمندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں جائیں گے۔

فرمایا:جو شخص کسی بیوہ اورمسکین کی خبر گیری کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کی ہے یا اس شخص کی جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو عبادت کے لئے

کھڑا رہتا ہے۔[1]

عوالی میں ایک بڑھیا بیمار تھی، اس کے جانبر ہونے کی امیدنہ تھی۔حضورﷺ نے فرمایا کہ جب اس کی وفات ہو تو مجھے ضرور خبر کرنا۔ میں جنازے کی نماز پڑھاؤں گا۔ اتفاق سے بڑھیا کا انتقال کچھ رات گئے ہوا۔ صحابہ نے آپ کو رات کے وقت اٹھانا گوارا نہ کیا اور بڑھیا کو دفن کردیا۔صبح کے وقت آپ ﷺنے دریافت فرمایا اور پوری کیفیت معلوم ہوئی تو اس خاتون کی قبر پر جاکر نماز جنازہ اداکی۔

ایک مرتبہ ایک قبیلہ مسافروار مدینہ منورہ آیا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ کسی کے بدن پر ثابت کپڑا نہ تھا، پاؤں ننگے تھے۔ کھالیں بدن پر بندھی ہوئی تھیں اور تلواریں گلوں میں ڈال رکھی تھیں ۔ حضور ﷺکی نظر مبارک ان لوگوں کی خستگی پر پڑی تو چہرہ انور کا رنگ بدل گیا۔حالت اضطراب میں اندر تشریف لے گئے۔ پھر باہر آئے اور بلال ضللہعنہ کو اذان کا حکم دیا۔نماز کے بعد ایک خطبہ میں سب کو ان غریبوں کی امداد پر آمادہ کردیا۔

شفقت ورافت عامہ کے باب میں صرف اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ عبادات نافلہ چھپ کر ادا فرماتے تاکہ عام لوگوں کے لئے آپ ﷺکی پیروی میں اس قدر عبادت کرنا شاق نہ ہو۔

مساوات

مساوات کی جیسی عملی مثالیں رسول اللہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب ۔

ﷺکی سیرۃ طیبہ میں ملتی ہیں ، ویسی اور کہاں ملیں گی؟ اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہوسکتی ہے کہ اپنے آزاد کردہ غلام زیدبن حارث کی شادی اپنی پھپھیری بہن سے کردی تا کہ اونچ نیچ کے فرضی اور خود ساختہ سانچے ریزہ ریزہ ہوجائیں ۔فتح مکہ کے بعد آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اس کے مندرجہ الفاظ پر غور فرمائیں :

”اے گروہ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹادیا۔تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے“۔

یہ مساوات کا محض درس ووعظ ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ سب سے بڑی،موثر اور ناقابل تردید دلیل بھی تھی۔دنیا کے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں ۔ آدم ہی سب کے مورث اعلیٰ تھے۔ اگر ایک گھرانے کے تمام ارکان درجے میں یکساں ہوتے ہیں تو پھر آدمؑ کی اولاد میں چھوٹے، بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ، آقا غلام کی تفریق کس بنا پر جائز سمجھی جاسکتی ہے؟ خون، رنگ، نسل، دولت وغیرہ کے امتیازات ان لوگوں نے پیدا کیے، جن کے ہاتھ سے حقیقت کا رشتہ نکل چکا تھا اور جو ہوسناکیوں کی بناپر انسانیت کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہوگئے تھے۔اللہ کے نزدیک انسانوں میں مراتب کا انحصار حسن عمل پر ہے۔ جس کے پاس عمل کا اندوختہ زیادہ ہوگا، وہ خدا کے نزدیک سب پر فایق ہوگا،اگرچہ کالا اور مفلس ہو۔ وہ لوگ اس سے نیچے رہیں گے جو حسن عمل میں

اس کے برابر نہ ہونگے، خواہ ان کے رَنگ کتنے ہی گورے اور ان کی دولت و ثروت کتنی ہی لامتنا ہی ہو۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں زید رضی اللہ عنہ،اسامہ رضی اللہ عنہ، بلال رضی اللہ عنہ یا دوسرے مساکین کا درجہ عباس رضی اللہ عنہ سے کم نہ تھا جو آپ ﷺ کے چچا تھے ۔جنگ بدر میں وہ قید ہوکر آئے تو انصار نے اس بنا پر ان کا زرخرید معاف کردینا چاہا کہ عباس رضی اللہ عنہ کے والد رشتے میں انصار کے بھانجے تھے مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر گز نہیں ، ایک دام بھی معاف نہ کرو۔

آپ ﷺ مسجد کی تعمیر میں صحابہ کے ساتھ برابر کام کرتے رہے۔ خندق کی کھدائی میں بھی آپ ﷺ نے برابر حصہ لیا۔ سفر میں صحابہ کھانا پکانے کا کام مل جل کر کرتے۔آپ ﷺ بھی کوئی نہ کوئی کام اپنے ذمہ لے لیتے۔ایک مرتبہ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں لانے کا کام آپ ﷺ نے سنبھالا۔ فدائیوں نے عرض کیا کہ یہ کام ہم کرلیں گے۔ فرمایا: "میں پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو تم سے ممتاز رکھوں ۔ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو ہمراہیوں میں ممتاز بنے۔"

جنگ بدر کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے نکلے تو سواریوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ تین تین کے حصے میں آیا،باری باری ہر فرد سوار تھا۔حضور ﷺ کے بھی دو ساتھی تھے،وہ عرض کرتے کہ آپ ﷺ سوار رہیں ، ہم پیدل چلیں گے۔

فرمایا: نہ میں چلنے میں تم سے کم طاقت ور ہوں اور نہ ثواب کے لیے میں تم سے کم محتاج ہوں ۔

مشہور واقعہ ہے کہ بنی مخزوم میں سے ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی بعض لوگ اسے چھڑانا چاہتے تھے اور اس غرض سے اسامہ ضاللہعنہ بن زید ضاللہعنہ کو سفارشی بنا کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔آپ ﷺنے اسامہ ضاللہعنہ کی درخواست سنی تو فرمایا:کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو؟ پھر خطبہ دیا،جس میں ارشاد ہوا: پہلی امتیں صرف اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی جرم کا مرتکب ہوتا تو اس سے چشم پوشی کی جاتی، کوئی معمولی آدمی پکڑاجاتا تو اسے سزا دلاتے۔ اگر محمدﷺکی بیٹی فاطمہ ضاللہعنہا بھی چوری کرتی تو اسے بھی قطع ید کی سزا ضرور دی جاتی۔

ایثار

اخلاق و عادات شریفہ میں ایثار کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے یعنی دوسروں کو اپنی ذات بلکہ اعزہ پر بھی ہر معاملہ میں مقدم رکھنا ۔ آپ ﷺکو حضرت فاطمہ ضاللہعنہا سے جس قدر محبت تھی ا س کا بیان مشکل ہے۔ جب آپﷺ ملاقات کے لیے تشریف لاتیں تو آپ ﷺ فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے ، پیشانی پر بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے اور عموماً پوچھتے کوئی خاص کام تو نہیں ؟

ایک مرتبہ کسی غزوہ میں کچھ کنیزیں آئیں ۔رسول اللہ ﷺ انہیں تقسیم فرما رہے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی ایک خادمہ کی سخت ضرورت تھی کیونکہ عسر ت کے باعث کوئی ملازمہ نہ تھی اورگھر کا سارا کام حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خود ہی انجام دیتیں ، چکی پیستیں ، پانی کی مشک بھر لاتیں ۔ اس وجہ سے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے اور جسم مبارک پرنیل کے نشان نظر آتے تھے۔سیدہ رضی اللہ عنہا عالم حضور ﷺکی خدمت میں پہنچیں ۔ حضور ﷺ نے معمول کے مطابق پوچھا،کوئی کام ہے؟ سیدہ عالم رضی اللہ عنہا حیا و خود داری کے باعث کچھ نہ کہہ سکیں : حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی ترجمانی کی۔ حضور ﷺنے فرمایا:ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہوا۔ جب تک ان کا بندوبست نہ ہولے، میں دوسری طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ایک روایت میں ہے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادیاں بھی ایسی ہی درخواست لے کر آئی تھیں ۔ حضور ﷺ نے فرمایا:بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔

ایک دفعہ آپ ﷺ کو چادر تحفہ میں ملی، آپ ﷺ کو ضرورت تھی، رکھ لی۔ ایک صاحب حاضر خدمت ہوئے اور کہا،کیا اچھی چادر ہے۔ آپ ﷺ نے اتار کر ان صاحب کو دے دی وہ لے کرچلے تو لوگوں نے ملامت کی کہ تم جانتے تھے رسول اللہ ﷺ کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ یہ بھی معلوم

تھا کہ آپؐ کو چادر کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا میں نے تو اس لیے لے لی کہ اسی چادر کا کفن بناؤں گا اور یہ میرے لیے باعث برکت ہوگا۔

ایک صحابی کے پاس ولیمہ کے لیے کچھ نہ تھا ۔حضور ؐ نے فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔وہ جاکر لے آئے حالانکہ شام کو حضورؐ کے ہاں کھانے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اسی طرح ایک غفاری کی مہمانداری کے لئے بکری کا دودھ تھا جو خود پی کر رات گزارتے تھے۔ دودھ مہمانوں کو پلادیا اور خود رات فاقے سے گزاری۔

ایثار کے دو پہلو ہیں : ایک یہ کہ اطمینان و راحت کا مقام ہو تو دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ خطرے اور تحمل شدائد کا مقام ہو تو انسان خود آگے رہے۔ اور دوسروں کو پیچھے رکھے، یہ دونوں پہلو سیرۃ طیبہ میں جابجا نمایاں ہیں ۔

سوال اور گداگری سے کراہت

سوال اور گداگری انسانی کردار کے لئے بے حد مضر ہے۔اس سے احساس خود داری رفتہ رفتہ ماؤف ہوجاتا ہے۔ انسان تن آسان بن جاتا ہے۔ غیرت و حمیت کا آئینہ بے طرح مکدر ہوجاتا ہے۔ محنت و مشقت سے کسب حلال کے بجائے عجز و الحاح سے مانگنے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں میں عزائم امور کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی و اہمیت باقی نہیں رہتی۔ جس قوم کے

افــراد عــزائم کی لــذت ســے نــا آشــنا ہوجــائیں ، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ با مقصد زندگی کی لذت و صورت ســے محــروم ہوگــئیے معــذور یــا واقعی ضرورت مند افراد کا معاملہ الگ ہے لیکن جولوگ گداگری کو پیشہ بنالیتے ہیں وہ پورے معاشــرے کے لیے باعث ننگ و عار بن جــاتے ہیں ۔ رسـول اللہﷺ نے گـــداگری کے انســـداد پــــر بھی خـــاص تـــوجہ فرمائی۔

ایک مرتبہ ایک انصاری نے سـوال کیـاﷺفرمایـا: تمہارے پاس کچھ ہے؟۔ ایک بچھو نے اور پیــالے کــا ذکرکیا۔ آپﷺ نے دونـوں چـیزیں منگـوائیں اور دو درم میں فروخت کر دیں ۔ پھر فرمایـا: ایـک درم سے گھر میں کھانے کی جنس دے آؤ۔ دوسری ســے رسـی وغـیرہ خریـد کـر جنگـل میں نکـل جـاؤاور لکڑیاں لاکر بیچو۔ پنــدرہ روز کے بعـد وہ انصــاری آئے تــو ان کے پــاس دس درہم تھے۔ کچھ کــپڑا اور غلہ خریــدا اور اســی طــرح ایــک بہ کــا ر آدمی معاشرہ کا نہایت فعال رکن بن گیا۔ حضـور ﷺ نے فرمایا: یہ اچھا ہے یا یہ کہ اپنے چہرے پر گدائی کا داغ لگا کر روزِ قیامت حاضر ہوتے؟

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”اگر تم میں سے کوئی رسـی لے کـر جـائے اور لکڑیوں کا گٹھا پشت پر اٹھا کـر لائے اور فـروخت کرے اور یوں اللہ اس کی آبرو بچــائے تــو اس ســے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے،وہ اسے دیں یــا نہ دیں “[۵] ١ حکیم ضــللہعنہ بن حــزام کــا اپنــا

[۵] بخاری ، کتاب الزکوٰۃ ، باب قول اللہ تعالیٰ وَ فِی الرِّقَابِ

بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مانگا ،آپ نے دے دیا ،پھر مانگا،دے دیا اور فرمایا:

”حکیم! یہ مال ہرابھرا اور میٹھا ہے جواسے سخاوت نفس کے ساتھ لے گا، اسے برکت ہوگی، جو نفس کی طمع سے لے گا،اسے برکت نہ ہوگی،اس کی کیفیت اس شخص کی سی ہوگی جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا“۔

الید العلیا خیرٌمن السفلیٰ۔

”اونچا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔“

حکیم ؓنے پھر عمر بھر کسی سے کچھ نہ مانگا۔❶

پھر فرمایا:

”مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے پیچھے پھرے، کہیں سے ایک لقمہ یا دو لقمہ یا ایک کھجور، دوکھجوریں مل جائیں تو دوسرے دروازے پر چلا جائے، مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال نہیں کہ ضروریات سے بے نیاز کر دے، نہ کوئی اس کاحال جانتا ہے کہ صدقہ دے، نہ وہ اٹھ کر لوگوں سے کچھ مانگتا ہے۔“❷ ایک موقع پر تین چیزوں کو اللہ کے نزدیک نا پسندیدہ قرار دیا:

قیل وقال و اضاعۃ المال وکثرۃِ السوال

”فضول باتیں ، مال ضائع کرنا اور زیادہ مانگنا۔“❸

یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اللہ سے دعا کرے

وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللہِ (توبہ ۔۶۰)

❶ بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلۃ۔

❷ ایضاًایضاً باب من سال الناس تکثر

❸ ایضاًایضاً۔

کہ اسے سوالی وگداگری کی ذلت سے بچا یا جائے تو اللہ بچا دیتا ہے۔جو خدا سے غنا کا طلب گار ہو،اللہ اسے غنامر رحمت فرماتا ہے۔ جو شخص صبر کرتا ہے اللہ اسے اور دیتا ہے اور صبر سے بہترو و سیع تر دولت کوئی نہیں جو کسی کو دی گئی ہو۔

جو د وسخا

ابن عباس ضللہعنہ کی روایت ہے:

کان النبی ﷺ اجود الناس واجود ما یکون فی رمضان[4]

رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور آپ ﷺ کی سخاوت کا ظہور سب سے بڑھ کر رمضان شریف میں ہوتا تھا۔

حدیث ہے کہ:

مَاسُئِلَ النبی ﷺ عن شَیءٍ قط فقال لا[5]

"رسول اللہ ﷺ سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی گئی کہ آپ ﷺ نے جواب میں "لا" یعنی کلمہ نفی فرمایا ہو"۔

ایک مرتبہ کسی نے کچھ مانگا۔ فرمایا: "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ، تم میرے ساتھ آؤ۔"

حضرت عمر ضللہعنہ ساتھ تھے۔انھوں نے کہا: جب آپ ﷺ کے پاس کچھ نہیں تو آپ ﷺ پر کیا ذمہ داری ہے۔ ایک اور صاحب بھی تھے ،وہ بولے یا رسول اللہ ﷺ!۔ آپ دیتے جائیں۔عرش والا خدا آپ ﷺ

---

[4] بخاری: کتاب الادب باب حسن الخلق والسخا

[5] ایضاًایضاً۔

کومحتاج نہ کرے گا۔یہ سن کر آپ ﷺ فرط بشاشت سے مسکرادیئے۔

ایک مرتبہ کوئی چار اوقیہ چاندی نذر کرگیا۔ تین اوقیہ تو تین ضرورت مندوں کو دے دیے۔چوتھا لینے والا کوئی نہ آیا۔رات کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ حضور ﷺ کو نیند نہیں آتی ہے کبھی اٹھتے ہیں اور نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں ، پھر ذرا لیٹ کر اٹھتے ہیں اور نماز شروع کردیتے ہیں ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا:آپ ﷺ آرام کیوں نہیں فرماتے؟ حضور ﷺ نے چاند ی نکال کر دکھائی اور فرمایا مجھے ڈر ہے۔۔ مبادا یہ میرے پاس ہو اور موت آجائے۔

ایک مرتبہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے ۔فرمایا :ابوذر رضی اللہ عنہ،اگر کوہ احد میرے لیے سونا ہوجائے تو میں کبھی پسندنہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک بھی دینار باقی ہو،بجز اس رقم کے جو ادائے قرض کے لیے رکھ چھوڑ وں ۔[1]

احد بہت بڑا پہاڑ ہے۔ وہ سونے کا بن جائے تو اسے ایک دن میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم تین دن ضرور لگیں گے،ساتھ ہی قرض ادا کرنے کی اہمیت بھی واضع فرمادی اور ارشاد گرامی سے یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ حضور ﷺ اسی فیاضی اور سخاوت کے باعث مقروض رہتے تھے۔ کوئی چیز حضور ﷺ کے پاس آجاتی تو جب تک تقسیم نہ فرمادیتے مضطرب رہتے۔ایسے متعدد واقعات کتب حدیث میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

---

[1] سیرۃالنبی بحوالہ صحیح مسلم۔

آخر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ جامع ارشاد پیش نظر رکھ لیجئے۔

ماترک رسول اللّٰہ ﷺ دیناراً و درھماً و لاشاۃً ولا بعیرا ولا اوصٰی بشیئٍ۔

"رسول ﷺ نے (دنیا سے رحلت کے وقت) کوئی دینار اور کوئی درہم اور کوئی بکری یا کوئی اونٹ نہ چھوڑا اور نہ کسی شے کے لیے وصیت فرمائی"۔

جب باقی ہی کچھ نہ رہا تو وصیت کی کیا صورت تھی؟

سادگی اور بے تکلفی

رسول اللہ ﷺ کی پوری حیات طیبہ سادگی اور بے تکلفی میں گزری۔ کسی قسم کے لوازم امارت و غنا اپنے گرد جمع نہ کیے۔ لباس،بستر،کھانا غرض ہر چیز عمر بھر بہت سادہ رہی ۔ چٹائی،معمولی فرش یا زمین پر بیٹھنے میں کبھی تکلف محسوس نہ ہوا ۔ عدی بن حاتم بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو چمڑے کا ایک گدا تھا جس میں کھجور کی پتی بھری ہوئی تھی ، وہی عدی رضی اللہ عنہ کی طرف کھسکا دیا، خود زمین پر بیٹھ گئے۔عدی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے روبرو گدے پر بیٹھنا خلاف ادب سمجھا۔چنانچہ دوران گفتگو میں گدا حضور ﷺ اور عدی رضی اللہ عنہ کے درمیان پڑا رہا۔ فرمایا کرتے تھے ، گھر میں ایک بستر اپنے لیے،ایک بیوی کے لیے اور ایک مہمان کے لیے کافی ہے،چوتھا شیطان کا حصہ ہے۔[1]

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے جو مکان

---

[1] سیرۃ النبی بحوالہ داؤد۔

بنوائے تھے وہ دس دس بارہ بارہ فٹ کے کچے حجرے تھے، جن میں سے بعض کی دیواریں کچی تھیں اور بعض کے لیے کھجور کی ٹہنیاں کھڑی کر کے اوپر سے لپائی کردی گئی تھی۔کھجور کی شاخوں کی چھتیں تھیں ۔ اونچائی اتنی کہ آدمی کھڑا ہو کر ہاتھ اوپر اٹھائے تو چھت کو جا لگے۔ عبدالملک اموی کے عہد میں توسیع مسجد نبوی کے لیے ان حجروں کو منہدم کرانا ضروری سمجھا گیا تو اہل مدینہ بے اختیار رو رہے تھے۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ یہ حجرے محفوظ رکھے جاتے تاکہ دنیا دیکھتی کہ رسول اللہ ﷺ نے روے زمین پر کس سادگی، بے تکلفی اور زہدوقناعت میں دن گزارے۔

ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں کھانے کے لیے بلایا گیا۔دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ دیواروں پر پردے لٹک رہے ہیں ، باہر ہی سے واپس ہوگئے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مراجعت کا سبب پوچھا تو فرمایا: پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ زیب و زینت والے کسی مکان میں داخل ہو۔ اسی قسم کا واقعہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی پیش آیا۔ آپ ﷺ کسی غزوہ کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے مکان کی چھت کے ساتھ ایک کپڑا باندھ دیا ۔ واپس تشریف لائے اور چھت میں بندھا ہوا کپڑا دیکھا تو اسے اُتاردیا۔ فرمایا: خدا نے ہمیں اس لیے دولت نہیں دی کہ اینٹوں اور پتھروں کو کپڑے پہنائیں ۔

ایک مرتبہ کسی نے کمخواب کی قبا ہدیتہ
بھیجی، آپ ﷺ نے ذرا دیر کے لیے پہن لی، پھر اتار
کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دی ، وہ
روتے ہوئے آئے کہ جو چیز آپ ﷺ نے ناپسند
فرمائی، وہ مجھے عطا کی، فرمایا: پہننے کے لیے
نہیں فروخت کردینے کے لیے بھیجی ہے، چنانچہ
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے دو ہزار درہم میں
فروخت کردیا۔

صبر وحلم

صبر و حلم اور عفوو درگزر کے باب میں صرف
اسی امرکا اعادہ کافی ہے کہ آپ ﷺ نے عمر بھر
کسی سے ذاتی بدلا نہ لیا سب کو معاف فرماتے
رہے۔

ایک یہودی کے آپ ﷺ مقروض تھے ، اگرچہ ادائے
قرض کے وعدے میں تین روز باقی تھے، مگر
یہودی ہمیشہ سے سرمایہ پرست چلے آرہے ہیں ،
تین روز پہلے ہی آکر متقاضی ہوا بلکہ حضور ﷺ
کے عفو و حلم سے فائدے اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہہ
گزرا کہ عبدالمطلب کے خاندان کے لوگ بڑے نا ہند
ہوتے ہیں ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس و قت
موجود تھے،انھوں نے یہودی کو سختی سے جھڑک
دیا، رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور فرمایا: عمر
رضی اللہ عنہ تمہیں لازم تھا کہ میرے ساتھ اور اس
شخص کے ساتھ اور طرح کا برتاؤ کرتے،مجھے
حسن ادا کے لیے کہتے اور اسے حسن تقا ضا
سکھاتے،پھر یہ فرماتے ہوئے کہ اگرچہ و عدے پورا

ہونے میں ابھی تین روز باقی ہیں لیکن حضرت عمرضاللہعنہ سے کہا کہ اس کا قرض ابھی ادا کر دو اور بیس صاع[1] جنس زیادہ دینا کیونکہ تم نے اسے سختی سے ڈانٹا تھا۔

رؤسائے طائف نے دعوت اسلام کے سلسلے میں حضور ﷺ سے جو سلوک کیا تھا،وہ بیان ہوچکا ہے۔اوباشوں کو برانگیختہ کر کے حضور ﷺ پر پتھر بر سوائے۔خود آپﷺکا ارشاد ہے کہ پہاڑوں کا فرشتہ میرے پاس آیا جی حکم ہو تو دونوں طرف کے پہاڑ ان پر الٹ دوں ۔فرمایا: نہیں مجھے امید ہے ان کے اخلاف میں سے وہ لوگ اٹھیں گے جو خدائے واحد کو مانیں گے۔

غزوہ احد میں دندان مبارک ٹوٹ گئے اور آپﷺ زخمی ہوگئے۔ مگر یہی دعا فرمائی کہ اے خدامیری قوم کو سیدھا راستہ دکھا، وہ حقیقت حال سے نا آشنا ہیں ۔

خطبہ حج میں آپﷺ نے ایام جاہلیت کے خون اور قرضے ختم کردیے تو سب سے پہلا اپنے خاندا ن کا خون اور اپنے خاندان میں سے حضرت عباس ضاللہعنہ کا قرضہ ختم کیا۔

عام خصائل

رسول اللہﷺنے حسن معاملہ ، عدل و

---

[1] قاضی سلیمان مرحوم فرماتے ہیں کہ صاع ہمارے ہاں کے اوزان کے مطابق دوسیر ساڑھے تین چھٹانک کا ہوتا ہے۔ یہی واقعہ یہودی کے اسلام کا باعث بنا۔ اس نے نبی موعود کے حکم کے مطابق جو کچھ سن رکھا تھا اس کی آزمائش کے لیے یہ حرکت کی تھی۔

انصاف ،مہمان نوازی کے معیار قایم کیے۔آپ ﷺ شرم و حیا،عزم و استقلال اور شجاعت کاپیکر تھے۔ عائلی زندگی کا بہترین نمونہ حضورﷺ نے پیش کیا اور ازواج رضی اللہ عنہن سے اچھے برتاؤ کے بارے میں بار بار تاکید فرمائی۔ فرمایا: تم میں سے بہتروہ ہے جو اہل خانہ کے لیے بہتر ہے۔ چرندو پرند سب پر شفقت فرماتے۔ دوسروں کے کام کردینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے اور اس میں ادنیٰ اعلیٰ کی کوئی تمیز نہ تھی۔ کسی کا بھی احسان لینا گوارا نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر جان نثاری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ جن کے لیے فرمایا کہ ان کے مال اور صحبت کا میں سب سے زیادہ ممنون ہوں ۔تاہم ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو ناقہ آپﷺ کے لیے پالی تھی، وہ نذر کرنی چاہی تو آپﷺ نے قیمت دے کر خریدی۔ مسجد النبوی ﷺ کی زمین مالک اور ان کے سر پرست ہبہ کردینے پر اصرار کرتے رہے۔ مگر آپ ﷺ نے قیمت دے کرلی۔

ادائے عبادات میں بھی سہولت عامہ بطور خاص ملحوظ خاطر رہتی تھی۔حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ نماز فجر میں لمبی سورتیں پڑھتے ہیں تو فرمایا: تم میں سے جو نماز پڑھا ئے مختصر پڑھائے کیونکہ مقتدیوں میں بوڑھے، ضعیف اور کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں ۔زیادہ مدح و ستایش بھی پسند نہ تھی۔ آپﷺ وضو فرماتے تو صحابہ دست مبارک سے گرنے والے پانی کو چلو میں لے کر

برکت کے لیے بدن پر مل لیتے ہیں۔ پوچھا ایسا کیوں کر رہے ہیں ؟ عرض کیا خدا و ررسول ؐ کی محبت میں ،فرمایا:اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول ؐسے محبت رکھتا ہے تو چاہیے کہ جب وہ بات کرے،سچ بولے،جب اسے کوئی امانت سونپی جائے تو اس کا حق ادا کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو حق ہمسایگی اچھی طرح نبا ہے۔

بعض اہم ارشادات

آپ ؐ کے بعض اہم ارشادات یہاں درج کیے جاتے ہیں ،جن سے اسلام کی تعلیم اور خود حضور ؐ کی عملی زندگی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

۱۔ ”تم میں سے جب کوئی شخص کسی کو مال اور صورت میں برترو افضل دیکھے تو چاہیے کہ اس کی طرف بھی دیکھ لے جو دیکھنے والے سے کمتر اور نیچے ہے“۔[1]

(دیکھیے افضل و برتر دیکھنے سے دل میں حسد پیدا ہوگا جو گوناگون برائیوں کا سرچشمہ ہے، کمتر شخص کو دیکھنے سے شکر کا جذبہ ابھرے گا جو نیکیوں کا وسیلہ ہے۔)

۲۔ ”تو مسلمانوں کو باہم رحم، محبت ا ور مہربانی میں ایک جسم کی طرح دیکھے گا، جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے پورا جسم

---

[1] بخاری : کتاب الرقاق، باب لینظر الی من ہوا سفل منہ۔

بے خوابی اور بخار کے ساتھ پکارتاَ ہے”۔❷

سعدی نے اس حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

چوعضوے بہ درد آورد روزگار دگر عضو ہارا نہ ماند قرار

۳۔ ”جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیئے کہ یا تو اچھی بات کہے یا چپ رہے”۔❸

۴۔ ” آپس میں بغض نہ رکھو،حسد نہ کرو،باہم تعلقات نہ توڑ و اور اللہ کے بندو،بھائی بھائی ہوجاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے” ۔❹

۵۔ ”سچائی اور راست بازی نیکی کی طرف لے جاتی ہے، اور نیکی جنت میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر سچ بولتا رہتا ہے،یہاں تک کہ صدیق ہوجاتا ہے (اسی طرح) جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے، برائی آگ میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا کے نزدیک کذاب لکھا جاتا ہے”۔❶

۶۔ ”شہ زوری دوسرے کو پچھاڑنا نہیں ،شہ زور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے”۔❷

کسی فارسی شاعر نے ہمارے عہد کی حالت کا نقشہ کیا خوب کھینچا۔

---

❷ بخاری : کتاب الادب، باب رحمۃالناس۔

❸ بخاری : کتاب الادب ، باب من کان یومن باللہ۔

❹ بخاری ایضاً باب ماینھٰی عن التحاسد

❶ ایضاً باب ما ینھٰی عن الکذب

❷ بخاری: ایضاً باب الحذر من الغضب

دستے کہ عنان خویش گیرد امروز بہ آستین کس نیست۔

۷۔ ”راست روی اختیار کرو،باہم محبت بڑھاؤ اور لوگوں کو خدا کی طرف سے بشارت پہنچاؤ، تنہا عمل تو کسی کو بھی جنت میں نہ لے جائے گا“۔❸

۸۔ ”جو شہرت کے لیے کام کرے گا،اللہ اسے فضیحت دے گا، جو ریا کے لیے کام کرے گا اللہ اس کی اصل حقیقت لوگوں کو دکھا دےگا “۔❹

۹۔ ”خبردار! بدگمانی کو اپنی عبادت نہ بنانا،بدگمانی تو جھوٹ ہے، بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ، دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو،آپس میں بغض نہ رکھو“۔❺

۱۰۔ ”اسیروں کور ہائی دلاؤ،بھوکوں کو کھانا کھلاؤ،بیماروں کی عیادت کرو“۔

۱۱۔ ”لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو،انھیں تنگی اور سختی میں نہ ڈالو،خوشخبری اور بشارت سناؤ،نفرت نہ دلاؤ،مل جل کر رہو“۔

۱۲۔ ”دو نعمتیں ہیں ،جن کی قدر اکثر لوگ نہیں جانتے:اول تندرستی دوم فراخدستی“۔

۱۳۔ ”تم میں سے کوئی موت کی خواہش نہ کرے،نیک آدمی تو اس لیے کہ شاید وہ اور نیک کام کرے اور بد اس لیے کہ شاید وہ معافی مانگ لے “۔❻

---

❸ بخاری : کتاب الرقاق، باب القصد والمدامة علی العمل۔

❹ بخاری، ایضاً باب الریا واس معہ۔

❺ رحمۃ اللعٰلمین ص ۳۵۳ بحوالہ بخاری ۔

❻ کتاب المرضیٰ باب تمنی المریض الموت۔

پانچ مذموم خصلتیں

" پانچ مذمو م خصلتیں ایسی ہیں کہ جب وہ تم پر نازل ہوں تو میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ خصلتیں تم لوگ اختیار کرو:

۱۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم میں فواحش کا ظہور اس حد پر پہنچ گیا ہو کہ لوگ علانیہ ان کاارتکاب کرنے لگیں اور اس قوم میں طاعون اور ان بیماریوں کا ظہور نہ ہوا ہو،جو ان کے باپ دادا میں موجود نہ تھیں ۔

۲۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے ناپ اور تول میں کمی شروع کی ہو اور اس قوم کو قحط سالی،گرانی،سخت محنت و مشقت اور حکمرانوں کے ظلم و جودنے گرفت میں نہ لیا ہو۔

۳۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اپنے اموال میں سے زکوٰۃ دینا بند کیا ہو اور اسے آسمان سے ہونیوالی بارش سے محروم نہ کر دیا گیاہو، اگر بہائم نہ ہوں تو بارش بالکل روک دی جائے۔

۴۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اللہ اور اس کے رسول کا عہد توڑا ہو اور اس پر اغیا رکو دشمن بناکر مسلط نہ کر دیا گیا ہوا ور وہ اس قوم کے اموال کا ایک حصہ نہ چھین لیں ۔

۵۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم کے پیشواؤں اور رہنماؤں نے کتاب اللہ کے مطابق حکومت سے اعراض کر کے خدائی احکام کے خلاف زبردستی

اپنے احکام نافذ کرنا شروع کیے ہوں اور اللہ نے
اس قوم کے اندرجدال و قتال اور دشواریاں نہ
پیدا کی ہوں "ہ۵

نور حق کے لیے والہیّت

قرآن مجید میں جابجا اسلام کو نور کہا گیا ہے یعنی حق کی روشنی،مثلاً :

۱۔ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَهٗ ۔ (اعراف:۱۵۷)

"پیروی کی اس نور کی جو اس کے (رسو ل اللہ ﷺ کے) ساتھ اترا ہے"

۲۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ (زمر: ۲۲)

" بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے اسلام کے لیے سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے ہے"

۳۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۔(بقرہ:۲۵۷)

" اللہ ان کا ساتھی اور مددگار ہے،جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں انہیں تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے۔"

بعض مقامات پر "نور" اس طرح آیا ہے کہ بعض مفسرین کرام کو خیال ہواغالباً اس سے مراد خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ جیسے سورہ مائدہ میں ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۱۵۔ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ ۔ (مائدہ ۱۵۔۱۶)

---

۵ سیرۃ ابن ہشام القسم الثانی ص ۶۳۱

”اللہ کی طرف سے تمہارے پاس“نور” (رسول اللہ ﷺ یا حق کی روشنی) آچکا نیزوہ روشن کتاب آچکی جس کے ذریعے سے اللہ اپنی رضا و خوشنودی کے پیروں کو سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت دیتا ہے۔“

مندرجہ ذیل دعا سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کے قلب منور میں “نور حق” کے لیے کس درجہ والہیت اور شیفتگی تھی اور یہ دعا آپ روزا نہ پڑھتے تھے۔

اللّٰھُمَّ فِی قلبی نوراً وَّ فی بصری نوراً وَّ فی
سمعی نوراً وَّ عن یمینی نوراً وَّ عن یساری نوراً
وَّ فوقی نوراً وَّ تحتی نوراً وَّ امامی نوراً وَّ خلفی
نوراً وَّ اجعل لی نوراً وَّ فی لسانی نوراً وَّ فی
دمی نوراً وَّ فی عصبی نوراً وَّ فی شعری نوراً وَّ
فی بشری نوراً۔ اللّٰھُمّ اعطنی نوراً، اللّٰھُمَ اعظم
لی نوراً، اللّٰھم اجعلنی نوراً۔

” الٰہی! میرے قلب میں نور ہوا ور میری آنکھوں میں نور ہواور میرے کانوں میں نور ہو، اور میرے داہنے نور ہو،میرے بائیں نورہو، میرے اوپر نور ہو اور میرے نیچے نور ہو اور میرے آگے نور ہو اور میرے پیچھے نور ہو اور نور میرا بنادے اور میری زبان میں نورہو، میرے خون میں نور ہوا ور میرے پٹھوں میں نور ہو اور میرے بالوں میں نور ہو، میرے چہرے پر نور ہو ، الہیٰ مجھے نور عطا فرما، الہیٰ میرے نور کو بڑھا،الہیٰ مجھے نورہی بنادے۔“

سنت رسول پاک ﷺ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی سنت کے متعلق پوچھا۔ فرمایا:

۱۔المعرفۃ راس المالی	معرفت میری اصل پونجی ہے۔
۲۔ والعقل اصل دینی	عقل سلیم میرے دین کی اصل ہے۔
۳۔و الحبّ اساسی	محبت میری بنیاد ہے۔
۴۔والشوق مرکبی	شوق میری سواری ہے۔
۵۔والذّکر انیسی	اللہ کا ذکر میرا انیس ومونس ہے۔
۶۔والثّقۃ کنزی	اعتماد الٰہی میرا خزانہ ہے۔
۷۔والحزن رفیقی	(ہم جنسوں کی فلاح کے لیے اندوہ قلب میرا رفیق ہے)
۸۔والعلم سلاحی	علم میرا ہتھیار ہے۔
۹۔والصبر ردائی	صبر میری ردا ہے۔
۱۰۔والرضا غنیمتی	رضا ے باری تعالیٰ میری غنیمت ہے۔
۱۱۔ والعجز فخری	عاجزی میرا سرمایہ فخر ہے۔
۱۲۔والزھد حرفتی	زہدمیرا پیشہ ہے۔
۱۳۔والیقین قُوتی	یقین میری روزی ہے۔
۱۴۔والصدق شفیعی	راست باز ی اور صداقت میری شفیع یعنی ساتھی ہے۔

۱۵۔والطاعۃ حسبی طاعت حق میری عزت ہے۔

۱۶۔والجہاد خلقی جہاد یعنی راہ حق میں انتہائی سعی و جہد میری جبلی ہے۔ خصلت

۱۷۔وقرۃ عینی فی الصلوٰۃ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

کیا تاریخ عالم کی کسی شخصیت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس میں خصائل جمیلہ اور شمائل حسنہ اس پیمانہ پر جمع ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی ذات بابرکات میں بہ درجہ کمال جمع کردیے تھے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی دوسری شخصیت کی ایک ایک خصوصیت،ایک ایک حرکت ،ایک ایک عمل اور ایک ایک ارشاد مستندروایات کی بناءپر آج تک اس طرح محفوظ بھی نہیں ہوا،جس طرح رسول اللہ ﷺ کے متعلق ایک ایک چیز جمع ہوئی۔صدق اللہ عذ و جلہ

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ (الرعد۔ ۱۷)

”پس جھاگ تو خشک ہو کر جاتا رہتا ہے (کیونکہ وہ کسی کام نہ تھا) اور جس میں بندگان خدا کے لیے نفع ہو، وہ چیزیں زمین میں باقی رہتی ہیں۔“

رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء۔ ۱۰۷)

نوع اِنسانی کے لیے رحمت

یہاں پیغمبر اسلام کے ظہور کا ایک ایسا وصف بیان کیا گیا ہے جو قرآن کے بیان کردہ اوصاف میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔[1] یعنی رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ! یہ ظہور کسی ایک ملک، کسی ایک قوم ، کسی ایک نسل ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہے۔ یہ وصف بیان کرکے قرآن نے ایک کسوٹی ہمارے حوالہ کردی ہے۔ اس پر ہم اس ظہور کی ساری صداقتیں پرکھ لے سکتے ہیں ۔ اگر یہ فی الحقیقت تمام نوع انسانی کے لیے رحمت کا ظہور ثابت ہُوا تو اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں ۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو پھر سچائی نے قرآن کا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارا فرض ہے کہ حقیقت کا اعتراف حقیقت کے لیے کرلیں ۔

---

[1] وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ
"اور اے پیغمبر ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ پوری کائنات کے لیے رحمت کا ظہور ہو"

یہ جانچ تاریخ کی بے لاگ اور بے رحم جانچ ہونی چاہیے ۔ ہر طرح کی مذہبی خوش اعتقادیوں سے منزہ، ہر طرح کی خود پر ستانہ طرف داریوں سے پاک ، کیونکہ یہاں حقیقت کی عدالت موجود ہے اور وہ صرف حقیقت ہی کی شہادت پر کان دھرتی ہے۔

تاریخ کا فیصلہ

جہل و تعصب نے ہمیشہ اعلان حقیقت کی راہ روکنی چاہی ہے، لیکن روک نہیں سکی۔ اس کے فیصلہ میں بھی تاریخ نے دیر لگائی، لیکن بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑا، ضروری ہے کہ فیصلہ خود اسی کی زبانی سُناجائے اور ایک معتقد کی طرح نہیں بلکہ ایک مورخ کی طرح عالم انسانیت کے ایک ایک گوشہ سے شہادت طلب کی جائے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی، جو اس موضوع پر عملی حیثیت سے وقیع سمجھی جا سکے۔ ہم نے “مقدمۂ تفسیر” میں اس کی کوشش کی ہے اور ایک خاص باب کا موضوع بحث یہی مسئلہ ہے۔ یہاں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں ، اس لیے مجبوراً قلم روک لینا پڑتا ہے۔(سُورۂ انبیا کا حاشیہ)

ابررحمت اور شادآبی زمین

جب زمین پیاسی ہوتی ہے تو ربّ السمٰوٰت والارض پانی برساتا ہے، جب انسان اپنی غذا کے

لیے بہ قرار ہوتا ہے تو وہ موسم ربیع کو بھیج دیتا ہے، جب خشک سالی کے آثار چھا جاتے ہیں تو آسمان پر رحمت کی بدلیاں پھیل جاتی ہیں :

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ (روم:۴۸)

”وہ خدا ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور ہوائیں بادلوں کو اپنی جگہ سے ابھارتی ہیں اور جس طرح اس کی مرضی نے انتظام کردیا ہے، بادل فضا میں پھیل جاتے ہیں ، پس تم دیکھتے ہو کہ ان کے اندر سے مینہ برسنے لگتا ہے اور تمام زمین سرسبز و شاداب ہوجاتی ہے پھر جب وہ اپنے بندوں پر جو بارش سے مایوس ہوگئے تھے، پانی برسادیتا ہے، تو وہ کامیاب و خرم ہوکر خوشیاں منانے لگتے ہیں “۔

قدرتی مثالوں کی حکمت

خدا کی تمام مثالیں اور دانائیاں جو وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کھولتا ہے، ہمیشہ عام اور قدرتی مناظر سے تعلق رکھتی ہیں تاکہ زمین کی ہر مخلوق ان کی تصدیق کرسکے اور ان سے دانائی حاصل کرسکے وہ ایسے تغیرات و حوادث اور غیر فطری و صناعی چیزوں کا ذکر نہیں کرتے جن کو دیکھنے سمجھنے کے لیئے کسی خاص طرح کی زندگی، خاص طرح کے علم اور خاص طرح کے گرد و پیش کی ضرورت ہو، بلکہ

اِس کی ہر تعلیم ایسی عام اور خالص فطری حالات سے متعلق ہوتی ہے ، جس کو سن کر جنگل کا ایک چرواہا اور متمدن آبادیوں کا فیلسوف دونوں یکساں اثر کے ساتھ خدا کی سچائی کو پاسکتے ہیں ۔ پس اگر تم نے فلسفہ و حکمت نہیں پڑھا، اگر تم نے اجرام سماویہ کے دیکھنے کے لیے کسی رصد خانے کی قیمتی دُور بین نہیں پائی، اگر تم کو مادے کے خواص کا تجربہ نہیں ، اگر تم کسی دارالعلوم کے اندر برسوں تک نہیں رہے، اگر تم صحرائی ہو، اگر تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر گوشہ نشین ہو، اگر پھونس کی ایک چھت اور بانسوں کی ایک شکستہ دیوار ہی رہنے اور بسنے کےلیے تمہارے حصے میں آئی ہے اور اس طرح تم نہیں جانتے کہ اپنے خدا کو آسمان کے عجیب و غریب ستاروں کے اندر کیونکر دیکھو اور اس کے حسن و جمال کو عناصر و ذرات خلقت کی آمیزش و آویزش کے اندرکیونکر ڈھونڈو، تاہم تم انسان ہو، تم کو روح دی گئی ہے اور تم زمین پر بستے ہو، تم آسمان کی ہر بدلی کے اندر، بادلوں کے ہرٹکڑے کے اندر، ہواؤں کے ہر جھونکے کے اندر، بارانِ رحمت کے ہر قطرے کے اندر ، اپنے خداوندحی و قیوم کو، اس کی حکمت و قدرت کو، اس کی رافت و رحمت کو، اس کے پیاراور محبت کو دیکھ سکتے ہو اور اسے پاسکتے ہو۔ تم میں سے کون ہے جس نے امید و بیم کی نظروں سے کبھی آسمان کو نہیں دیکھا

اور اس کی بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج کے اندر اپنی کھوئی ہوئی امید کو نہیں ڈھونڈا؟

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (روم:۲۴)

" اورقدرت الٰہی کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ جب زمین پیاسی ہوتی ہے اور خشک سالی کے آثار ہر طرف چھاجاتے ہیں تو وہ آسمان پر بارش کی علامتیں پیدا کردیتا ہے اور تم امید و بیم کی نظروں سے انھیں دیکھتے ہو"

موت کے بعد زندگی

پھر وہ کون ہے کہ جب تم اور تمہاری تشنہ و بیقرار زمین پانی کے ایک ایک قطرے کے لیے ترس جاتی ہے، خاک کا ایک ایک ذرہ رطوبت و نمو کے لیے بے قرار ہوجاتا ہے۔ کرہ ارضی اپنی بے خودانہ حرکت میں آفتاب کے آتش کدے سے قریب تر ہوجاتا ہے۔ اس کی تمام کائنات نباتات اپنا حسن و جمال فطری کھودیتی ہے، پرندے اپنے گھونسلوں میں ،ٹہنیاں درختوں میں اور انسان گھروں میں پانی کے لیے ماتم کرتا اور ہر دم آسمان کی گرم و خشک فضا کی طرف مایوسی کی نگاہیں اٹھاتا ہے تو وہ اپنی محبت و ربوبیت کے نقاب میں آتا ہے اور مایوسی کے بعد امید کا، نامرادی کے بعد مراد کا،موت کے بعد زندگی کا پیام زمین کے ایک ایک ذرے تک پہنچا دیتا ہے۔

وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۲۴ (روم ۲۴)

”اس کی ربوبیت و رحمت کو دیکھو کہ جب تم امید و بیم کی نظروں سے آسمان کو دیکھتے ہو اور تمام زمین پر مردنی اور ہلاکی چھاجاتی ہے تو وہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور زمین پر موت کے بعد زندگی طاری ہوجاتی ہے۔ یقیناً قدرت الٰہیٰ کی اس نمود میں صاحبان فکر و عقل کے لیے بڑی ہی نشانیاں رکھی گئی ہیں ۔“

روح کی پیاس اور دل کی بھوک

یہ وہ انتظام الٰہی ہے جو پروردگار عالم نے انسان کے جسم کی غذا کے لیے کیا ہے،پھر کیا اس نے انسان کی روح کے لیے کچھ نہ کیا ہوگا؟ وہ ر ب الارباب جو زمین کی پکارسن کر اسے پانی دیتا اور جسم کی بے قراری دیکھ کر اسے غذا بخشتا ہے، کیا سر زمین روح و معنی کی تشنگی کے لیے کچھ نہیں رکھتا اور دل کی بھوک کے لیے اس کے خزانوں میں کوئی نعمت نہیں ؟

وہ کہ اس کی محبت زمین کی مٹی کو خشک نہیں دیکھ سکتی اور درختوں کی ٹہنیوں کو وہ سبز پتوں اور سرخ پھولوں کی زیبائش سے محروم نہیں رکھتا، کیا روح انسانی کو ہلاکت و بربادی کے لیے چھوڑدے گا اور عالم انسانیت کا مرجھا جانا اسے خوشی دے گا؟وہ رب العٰلمین جو تمہارے جسم کو غذادے کر موت سے بچاتا ہے‘ کیونکر ممکن ہے کہ تمہاری روح کو ہدایت دے کر ضلالت سے نہ بچائے؟

جب فرعون نے حضرت موسٰی علیہ اسلام سے پوچھا کہ:

فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی ﴿۴۹﴾ (طٰہٰ:۴۹)

”تمہارا پروردگار کون ہے ،اے موسٰی؟“

تو حضرت موسٰی ؑ نے نہ صرف اپنے رب العٰلین کی نسبت خبر ہی دی،بلکہ اس کی الوہیت کی دلیل فطری وقطعی بھی چند لفظوں میں فرمادی:

رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۵۰﴾ (طٰہٰ:۵۰)

”ہمارا رب وہ ہے جو “رب” ہے اور اس کے لیے اس کی ربو بیت نے کائنات کی ہر چیز کو اس کی خلقی ضروریات بخشیں ،پھر اس کے بعد ان کی ہدایت کردی تا کہ صحیح اور فطری طریقہ پر کاربندرہ کر اپنی خلقت کے مقاصد حاصل کریں ۔“

پس اس نے کہ زمین کی مٹی کے اند ر قوت نشو و نما رکھی، پھر پانی برساکر اس کی ہدایت کردی ،یعنی اس کے آگے نفوذ و عمل کی راہ کھول دی اور جس کی ربوبیت نے عالم ہستی کے ایک ایک ذرہ کے لیے خلقت اور ہدایت دونوں کا سامان کردیا،ا نسان کو بھی جسم اور روح دونوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے لیے بھی خلقت اور ہدایت،دونوں کا سامان رکھتا ہے۔

رحمت باری تعالیٰ کے خزانے

اس کی ربوبیت نے جس طرح جسم کے لیے زمین کے اندر طرح طرح کے خزانے رکھے ہیں ، اسی طرح روح کی غذا سے بھی اس کے آسمانوں کی وسعت معمور ہے۔ جس طرح جسم کی غذا اور زمین کی مادی حیات و نموکے لیے آسمانوں پر بدلیاں پھیلتیں ، بجلیاں چمکتیں اور موسلا دھار پانی برستا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اقلیم روح و قلب کی فضا میں بھی تغیرات ہوتے ہیں ۔ یہاں اگر زمین کی مٹی پانی کے لیے ترستی ہے، تو وہاں بھی انسانیت کی محرومی ہدایت کے لیے تڑپنے لگتی ہے، یہاں پتّے جھڑتے ہیں ، ٹہنیاں سُوکھنے لگتی ہیں اور پُھولوں کے رنگین ورق بکھر جاتے ہیں تو تم کہتے ہو کہ آسمان کو رحم کرنا چاہیے، وہاں بھی جب سچائی کا درخت مُرجھاجاتا ہے، نیکی کی کھیتیاں سُوکھ جاتی ہیں ، عدالت کا باغ ویران ہوجاتاہے اور خدا کے کلمہ حق و صدق کا شجرہ طیّبہ دنیا کے ہر گوشہ اور ہر حصہ میں بے برگ و بار نظر آنے لگتا ہے تو اس وقت رُوح انسانیت چیختی ہے کہ خدا کو رحم کرنا چاہیے۔ یہاں زمین پر موت طاری ہوتی ہے تو خدا کی بارش اسے پھر اٹھا کر بٹھادیتی ہے:

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا
أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ
فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۵۷﴾ (اعراف: ۵۷)

”اور وہ پروردگار عالم ہی تو ہے کہ بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بارانِ رحمت کے آنے کی خوشخبری سنا دیتی ہیں ، یہاں تک کہ جب اس کا وقت آجاتا ہے تو وہ وزنی بادلوں کو حرکت دیتی ہیں اور ہم انہیں ایک ایسے شہر کے اوپر لے جاکر پھیلا دیتے ہیں جو ہلاک ہوچکا ہے اور زندگی کے لیے پیاسا ہے، پھر پانی برستا ہے اور زمین کی موت کو زندگی میں بدل دیتا ہے، اس کی نمو بخشی سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور مخلوقات اپنی غذا حاصل کرلیتی ہے، ٹھیک اسی طرح ہم مردوں کو بھی اٹھاتے ہیں اور یہ جو کچھ کہا گیا ہے سو دراصل ایک مثال ہے کہ تم دانائی اور سمجھ حاصل کرو“۔

رحمت الٰہی کی عالمگیر نمود

عالم انسانیت کی فضائے روحانی کا ایک ایسا ہی انقلاب عظیم تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں ظاہر ہوا وہ رحمت الٰہی کی بدلیوں کی ایک عالمگیر نمود تھی جس کے فیضان عام نے تمام کائنات ہستی کو سرسبزی و شادابی کی بشارت سنائی اور زمین کی خشک سالیوں اور محرومیوں کی بدحالی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا، وہ خدا وند قدوس ، جس نے سینا کی چوٹیوں پر کہا تھا کہ میں اپنی قدرت کی بدلیوں کے اندر آتشیں بجلیوں کے ساتھ آؤں گا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ میرے جاہ و جلال الٰہی

کی نمود ہوگی، سو بالآخر وہ آگیا اور سعیروفاران کی چوٹیوں پر اس کے ابرِکرم کی بُوندیں پڑنے لگیں ۔

یہ ہدایت الٰہی کی تکمیل تھی، یہ شریعت ربانی کے ارتقاءکا مرتبہ آخری تھا، یہ سلسلہ ترسیل رسل و نزولِ رحمت کا اختتام تھا۔ یہ سعادت بشری کا آخری پیام تھا، یہ وراثت ارضی کی آخری بخشش تھی، یہ امت مسلمہ کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہ حضرت ختم المرسلین و رحمۃ للعٰلمین محمد بن عبداللہ کی ولادت با سعادت تھی صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلم ۔

یہی واقعہ ولادت نبوی ہے جو دعوت اسلام کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہی ماہ ربیع الاول ہے، جس میں اس امت مسلمہ کی بنیاد پڑی، جسے تمام عالم کی ہدایت و سعادت کا منصب عطا ہونے والا تھا، یہ ریگستان حجاز کی بادشاہت کا پہلا دن تھا، یہ عرب کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدایش نہ تھی، یہ محض قوموں کی طاقتوں کا اعلان نہ تھا، اس میں صرف نسلوں اور ملکوں کی بزرگی کی دعوت نہ تھی جیسا کہ ہمیشہ ہُوا ہے اور جیسا کچھ کہ دنیا کی تمام تاریخ کا انتہائی سرمایہ ہے، بلکہ یہ عالم کی ربانی بادشاہت کا یوم میلاد تھا۔ یہ دنیا کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش تھی، یہ کرۂ ارضی کی سعادت کا ظہور تھا۔ یہ نوع انسانی کے شرف و احترام کا قیام عام تھا۔ یہ

انسانوں کی بادشاہتوں ،قوموں کی بڑائیوں اور ملکوں کی فتوحات کا نہیں بلکہ خدا کی ایک ہی اور عالمگیر بادشاہت کے عرش جلال وجبروت کی آخری اور دائمی نمود تھی۔ پس یہی دن سب سے بڑا ہے۔ کیونکہ اسی دن کے اندر دنیا کی سب سے بڑی بڑائی ظاہر ہوئی ۔اس کی یاد نہ تو قوموں سے وابستہ ہے۔ اور نہ نسلوں سے، بلکہ وہ تمام کرۂ ارضی کی ایک عام اور مشترک عظمت ہے۔ جس کو وہ اس وقت تک نہیں بھلا سکتی، جب تک اسے سچائی اور نیکی کی ضرورت ہے۔ اور جب تک اس کی زمین اپنی زندگی اور بقا کے لیے عدالت و صداقت کی محتاج ہے۔

دنیا کی بڑائیاں اور ان کے نتیجے

دنیا میں بڑے بڑے انقلاب ہوئے ہیں ۔ یہ انقلابات خاص انسانوں کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس لیے ان انسانوں کی پیدائش کے ایام کو بھی دنیا عظمت کے ساتھ یاد رکھنا چاہتی ہے۔ اور اس اعتبار سے اس کی یادگاروں کی فہرست بڑی ہی طویل ہے۔ اس میں بادشاہوں کے زرنگار تختوں کی قطاریں ہیں ۔ فاتحوں کی بے پناہ تلواروں کی جھنکار ہے۔ سپہ سالاروں کے زرہ بکتر کی ہیبت ہے۔ حکیموں کی حکمتوں اور دانائیوں کے دفاتر ہیں ۔ فلاسفہ وعلماءکے علوم و صحائف کے خزائن ہیں ، صناعوں کی ایجاد ہیں ۔ وطن پرستوں کے مواعظ ہیں ۔ قومی

پیشواؤں اور ملکی داعیوں کی جا نفشانیوں اور سرفروشیوں کی داستانیں ہیں ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا اگر اپنی عظمت کے اصلی دن کو یاد رکھنا چاہتی ہے تو ان میں سے کسے یاد رکھے؟ ان میں سے کون ہے جس نے دنیا کو سب سے بڑی چیز دی ہے تاکہ وہ بھی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کی یاد کو پیار کرے۔

اولوالعزم شہنشاہ

آؤ ، ہم سب سے پہلے بڑے بڑے اولوالعزم شہنشاہوں کو دیکھیں جنہوں نے دنیا کے بڑے بڑے رقبوں کو نوکِ شمشیر پر رکھ لیا اور ایسے عجیب و غریب ایوانوں اور محلوں میں بسے، جن کی دیواریں اور چھتیں چاندی ،سونے اور لعل و جواہر سے بنائی گئی تھیں ۔ انہوں نے بُہت زیادہ مال و متاع جمع کیا، ان کے پاس لوہے کے بہت سے آلات خونریزی تھے اور ان کی اطاعت و غلامی میں انسانوں کا سب سے بڑا گلہ تھا۔ پس ان کی پیدایش کے واقعہ کو بھی سب سے زیادہ عظیم الشان اور ناقابل فراموش ہونا چاہیے۔ لیکن اگر دنیا ان کی پیدایش کو یاد رکھے تو بتلاؤ دنیا کے لیے انہوں نے کیا کیا؟ ان کی فتو حات بہت وسیع تھیں اور ان کی وہ دولت جو انہوں نے زمین کی بستیوں کو اجاڑ کر لوٹی تھی، بڑے بڑے وسیع رقبوں کے اندر آتی تھی، لیکن دنیا کو اس سے کیا ملا کہ دنیا کی گردن ان کی یاد کے آگے : اگر وہ بہت بڑے فاتح تھے، تو اس کو یُوں کہو کہ انہوں

نے سب سے زیادہ زمین کو ویران کیا، سب سے زیادہ اس کی آبادیوں کو اجاڑا، سب سے زیادہ خُون کی ندیاں بہائیں اور سب سے زیادہ خدا کے بندوں کے گلے میں اپنی غلامی کی لعنت کا طوق ڈالا۔ پھر کیا دنیا اپنی ویرانیوں ، قتل و غارت، نہب و سلب اور اپنی غلامی کی لعنت کے ناپاک دنوں کو یاد رکھے؟ جن کی ابلیسیت نے یہ لعنت پھیلائی تھی، ان کی پیدایش کی نحوست پر خوشیاں منائے؟

سکندر اور دُوسرے فاتح

سکندر دنیا ئے قدیم کا سب سے بڑا فاتح تھا، جس نے پُوری دنیا سے اپنے تخت کی پوُجا کرانی چاہی، لیکن دنیا اگر اس کی پیدایش کو یاد رکھے تو یہ دن کن واقعات کی یاد ہوگا؟ یہ دنیا کی ویرانیوں ، ہلاکتوں اور غلامی کی لعنتوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہوگا، جو اسے ہاتھ آئے گا۔دنیا میں جس قدر بادشاہ پیدا ہُوئے،اگر تم ان کی زندگی کے تمام کارناموں کا حاصل معلوم کرنا چاہو، تو اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ وُہ جتنے بڑے بادشاہ تھے، اتنے ہی زیادہ انسانوں کو غلام بنانے والے تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی فطری قوتوں کے لیے پتھر تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی قدرتی حرکت و نشو کے لیے زنجیر تھے اور اتنے ہی زیادہ خدا کی عطا کردہ جبلت صالحہ اور انسان کے نوعی شرف و احترام کے لیے انکے اندر بربادیوں اور ہلاکتوں کی نحوست تھی ،پس جن

کا وجود خود دنیا کے لیے ایک زخم تھا،وہ ان کی یاد میں اپنی گم شدہ شفا کیونکر پاسکتی ہے؟

حکماء و فلاسفہ

حکماء کی حکمت ، فلاسفر کا فلسفہ، صناعوں کی ایجادیں ، بلاشبہ تاریخ عالم کے اہم مقامات ہیں ، لیکن اگر وہ اپنی یاد کے آگے دنیا کو جھکانا چاہتے ہیں ، تو انہیں بتلاناچاہیئے کہ انہوں نے اپنی حکمت سرائیوں اور عجیب عجیب ایجادوں سے دنیا کے اصلی دکھ اور زمین کی حقیقی مصیبت کے لیے کیا کیا؟ آسمان کی فضا میں ان گنت ستاروں کی قطاریں پھیلی ہوئی ہیں ۔ بلا شبہ وہ شخص بہت بڑا غور کرنے والا دماغ اور بڑی ہی کاوش کرنے والی نظر رکھتا تھا، جس نے ہمیں سب سے پہلے بتلایا کہ یہ بڑے بڑے ستارے ہیں ، ان میں ثوابت ہیں اور ان کی حرکتوں کے معین اوقات و ایام ہیں ، لیکن دنیا جب ستاروں کی یہ بہت بڑی سچائی نہیں جانتی تھی، تو اس وقت بھی بیمارتھی اور یہ معلوم کرکے بھی بیمار ہی رہی۔ اس کا اصلی دکھ یہ نہ تھا کہ انسان آسمان کے متعلق تھوڑا جانتا ہے، بلکہ ہمیشہ سے وہ اس ایک ہی مرض میں گرفتار رہی ہے کہ انسان خود اپنی نسبت ، اپنی فطرت صالحہ کی نسبت، اپنی راہ سعادت کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتا۔

صنعت گر

اس صناع کو اگر تم بڑا سمجھتے ہو، جس نے انسان کے لیے فن تعمیر ایجاد کیا تاکہ وہ پائدار مکانوں اور خوبصورت چھتوں کے نیچے بیٹھے، تو تمہیں بتلانا چاہیے کہ کیا انسان درختوں کے نیچے بیٹھ کر نیک اور سچا انسان نہ تھااور بڑے بڑے محلوں کے اندر بس کراس نے اپنی گم شدہ حقیقت پالی؟ دنیا کا اصلی مرض انسانیت حقیقی کی گم شدگی ہے۔ سعادت انسانی اور امن ارضی ہی وہ نعمت ہے۔ جس کی ڈھونڈ میں ابتدا سے کائنات کا ذرہ ذرہ تہ و بالا ہو رہا ہے۔ پھر بتلاؤ کہ اگر یہ بڑے بڑے صناع اور موجد ہی انسانیت کی سب سے بڑی بڑائی رکھتے ہیں ، تو ان کی ایجادوں نے انسان کو کس قدر امن دیا؟ کس قدر سلامتی بخشی؟ کہاں تک صراط سعادت پر چلایا؟ طلسم حیات انسانی کا کون سارا ز افشاءکیا؟ خدا اور بندوں کے رشتوں کو کہاں تک جوڑا؟ پھر اگر وہ یہ نہ کرسکے تو دنیا ان کی ایجادات کو اپنے خزانے میں رکھ سکتی ہے، لیکن ان کی یاد میں اس کے لیے کوئی خوشی نہیں ہوسکتی کیونکہ انہوں نے اس کے اصلی دکھ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔

دور حاضر

اچھا، دنیا ے قدیم کے ذخیرے میں جو کچھ ہے، اسے چھوڑدو، کلدان و بابل اور یونان و اسکندریہ کے کھنڈر اور مسمار شدہ آثار کے اندر اگر دنیا کے لیے کچھ نہ تھا، تو بہت ممکن ہے کہ آج لندن اور

برلن و پیرس کی عجیب و غریب آبادیوں اور
عقل وفہم کو مبہوت کردینے والے تمدن کے اندر
دُنیا کو وہ چیز مل جائے، جس کے لیے وہ ابتدائے
خلق سے حیران و سرگشتہ رہی ہے۔

موجودہ تمدن یورپ کی ابتدا جن بڑے بڑے
دعووں سے ہوتی ہے، ضرور ہے کہ وُہ سب کے
سب اس وقت تمہارے سامنے ہوں ،کیونکہ ہماری
موجودہ صحبت ان کے اعادے کی متحمل نہیں۔
ہم کو بتلایا گیا تھاکہ موجودہ تمدن کو دنیا کے
قدیم تمدنوں سے کوئی مشابہت نہیں ، ان کی
مختلف شاخوں میں باہم ربط و علاقہ نہ تھا، ان
کی بنیادیں صحت و حقیقت پر نہ تھیں ، وہ
انسانی علم و عمل کی تمام شاخوں کو بیک
وقت مکمل نہ کرسکی تھی، انہوں نے معلومات
و اعمال میں کوئی صحیح نظم و ترتیب پیدا نہیں
کی اور انہیں اپنے تمدن کی اشاعت اور پھیلاؤ
کے وہ ذرائع حاصل نہ تھے جن کے ذریعے ہم نے
کرۂ ارضی کو علم و تمدن کا ایک گھر بنادیا ہے۔
پس گزشتہ تمدنوں کی ناکامی سے موجودہ تمدن
کی ناکامی پر استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے اور
اسی طرح کے دعوے تھے جن سے موجودہ تمدن
کی فضا بھر گئی تھی اور جن کے ذریعے سے
اعلان کیا جاتا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی
طاقت موجودہ تمدن کی ہے، حالانکہ سب سے بڑا
صرف خدا ہے:

لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا
۲۱ (فرقان : ۲۱)

”بلاشبہ انہوں نے یہ کہہ کر اپنے اندر بڑا گھمنڈ پیدا کیا اور بڑی سخت درجہ کی سرکشی کی۔“

اپنے ہاتھوں گھر برباد کرنے والے

سواب تم دیکھو کہ دنیا اپنے اعتراف کا سرجھکانے کے لیے جب تمدن کے اس سب سے بڑے مغرور بت کی طرف جاتی ہے، تو اسے کیا جواب ملتا ہے؟

آج تمدن کے ابلیسانہ گھمنڈ کا ملعون بُت چُور چُور کردیا گیا ہے ، خدا کا وہ زبردست اور بے پناہ ہاتھ جو قوم ثمود وعاد اور بڑی بڑی آبادیوں اور بڑے بڑے خیموں والوں کو سزا دے چکا تھا، اپنے جلال اور ہولناکی کی آتیشوں کی چمک دکھلا رہا ہے۔ تم یورپ کی موجودہ جنگ[1] اور متمدن اقوام کے باہمی قتل و خونریزی پر چارپایوں کی طرح نہیں بلکہ انسانوں کی طرح نظر ڈالو اور دیکھو کہ یہ کیا ہے جو تمہارے سامنے ہو رہا ہے؟ یہ تمدن اور وحشت کی پکار نہیں ، یہ علم اور جہل کی ٹکر نہیں یہ تمدن ہے جو تمدن سے ٹکرا

---

[1] یہ مقالہ پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴۔۱۹۱۸) کے دوران میں لکھا گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ(۱۹۳۹۔۱۹۴۵) نے اس کے مطالب کی مزید تصدیق کردی ہے۔ عادوثمود،فرعون اور ہزاروں دوسرے سرکش مختلف طریقوں سے فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ یورپ پر موت و ہلاکت کی جو ہولناک آفتیں عالمی جنگوں کی شکل میں مسلط ہوئیں ‘ وہ بھی تو بہ ہر حال ویسے ہی عذاب تھے جو سابقہ قوموں پر مختلف اوقات و ادوار میں نازل ہوچکے تھے۔ کیا اہل یورپ نے اپنے ہاتھوں اپنے گھر برباد نہ کیے؟ ہٹلر،سٹالین، چرچل، دوسرے لوگ ایک دوسرے کو کا ملاً مٹا دینے کے لیے ہر ممکن جدوجہد نہ کرتے رہے؟

رہا ہے، یہ علم ہے جو علم کو ذبح کررہا ہے۔ یہ صناعت ہے جو صناعت کو پیس رہی ہے۔ یہ ایجاد کا مغرور شیطان ہے، جو ایجاد ہی کے شیطان لعین کو ڈس رہا ہے اور اس طرح تمدن کا گھمنڈ ہی ہے جو تمدن کے گھمنڈ کوریزہ ریزہ اور پاش پاش کررہا ہے۔

يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيْدِيهِمْ "اپنے گھروں کو وہ اپنے ہاتھوں ہی سے اجاڑ رہے ہیں ۔"

پس اگر مسکین دنیا ان انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے جو تمدن کے بادشاہ تھے، علم کے فرمانبردار تھے اور ایجاد صناعت کے دیوتا تھے، تو تم اس کا ہاتھ پکڑو اور اسے آج یورپ کے ان میدانوں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دو جہاں تمدن و علم کا تخت عظمت و جلال آگ اور لہو کی بدلیوں اور دُھوئیں اور زہریلی گیسوں کی مسموم فضا کے اندر بچایا گیا ہے اور مسمار عمارتوں کے کھنڈروں ، سُرخ سرخ خون کی ندیوں اور انسانوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کے تودوں پر اس کے سنہرے ستون عظمت نصب کیے گئے ہیں ۔ پھر اس سے کہو کہ وہ اپنی احسان مندی اور شکرگزاری کے لیے ان عظیم الشان انسانوں میں سے کسی کی بڑائی کو چھانٹ لے، جو آج گیہوں اور جَو کے لیے روتے ہیں کیونکہ ہوا میں اڑنے کے آلات اور پانی کو مفرد اجزا میں بدل لینے کاعلم ان کے کچھ کام نہ آیا۔

کس کی یاد منائیں ؟

وہ ان میں سے کس کو اپنی پرستش اور یاد

کے لیے چُنے گی؟ کیا وہ ا س سب سے بڑے فلسفی کو یادکرے گی، جو چودھویں صدی عیسوی میں آیا اور اس نے تجربہ کی راہ کھولی، جس راہ نے انسانوں کو ہلاکت اور خونریزی کے سب سے زیادہ رُوح پاش آلات تک پہنچا دیا؟ وہ کیمسٹری کے اس دیوتا کو یاد کرے گی جس پر موجودہ تمدن کو سب سے زیادہ ناز ہے اور جس نے ایسی زہریلی گیسیں ، ایسے مہلک بم اور شیل اور ایسے بے پناہ مرکبات بنادیے جن کے آگے انسانی جماعتیں بالکل بے بس ہوجاتی ہیں اورمنٹوں کے اندر بڑی بڑی آبادیاں موت کی لعنت سے بھر جاتی ہیں ؟ اچھا، بھاپ کی طاقت کے مؤجد کو بلاؤ، اس کی بڑائی کیسی عجیب تھی جس نے بھاپ کی غیر معلوم طاقت کو انسان کے تابع کردیا؟ لیکن آہ! وہ اس دنیا کے لیے کیا کرے جو موت کی نہیں ، بلکہ زندگی کی بھُوکی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ بھاپ کے شیطان ہی کے اندر وہ سب سے بڑی بے پناہ خباثت ہے، جس نے آج جنگ کے میدانوں میں مختلف بھیسوں اور مختلف صورتوں کے اندر موت کی سب سے بڑی پھنکار ماردی ہے اور تمام انسانی علم و دانائی اس کے بچاؤ کے لیے بیکار ہے!

پھر کیا دنیا تمدن و علم کے ان مغرور بانیوں کی پیدائش پر خوشیاں منائے جنہوں نے اس کی موت اور ہلاکت کے لیے تو سب کچھ کیا، پر اس کے امن و سلامتی اور سعادت و طمانیت کے لیے کچھ نہ کرسکے؟ ان کے پاس انسان کے اڑنے ،

سمندروں کے اندر جانے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تموج اور ذرات کو اپنے نامہ و پیام کا سفیر بنانے اور خودبخود بجنے والے باجوں اور بڑے تیزی سے چلنے والی سواریوں کے لیے تو بڑا ذخیرہ ہے۔ لیکن انسان کو نیک اور راست باز بنانے، خدا کی عدالت و صداقت سے زمین کو معمور کرنے،امن اور راحت کی بادشاہت کے قائم کردینے ، ظلم و فساد کے بیج سے زمین کوصاف کرنے، طاقت اور حکم کے جبر سے ضعف اور ناتوانی کو بچانے اور انسانوں کو درندوں اور سانپوں کی طرح نہیں ، بلکہ انسانوں کی طرح بسادینے کے لیے کُچھ بھی نہیں ۔

قرآن حکیم کا درس حکمت

تم نے یورپ کے تمدن کی، کتوں کی طرح لو ٹ کر اور بھیڑوں کی طرح چل کر ہمیشہ پر ستش کی ہے اور مذہب کی تعلیمات کی ہنسی اڑائی ہے کہ وہ "آخرت آخرت" کہتا ہے،مگریورپ کی طرح دنیا کے لیئے کچھ نہیں بتلاتا لیکن شاید تم آج قرآن کی اس آیت کو سمجھ سکوجس کے متعلق حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اس کی تلاوت آخری زمانے کے فتنے سے بچائے گی:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۱۰۳ۭ اَلَّذِيْنَ
ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ
اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۱۰۴ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا
نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ

الْقِیٰمَۃِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ (کہف:۱۰۳ ۔۱۰۵)

”تم کوبتلاؤں کہ سب سے زیادہ ناکام و نامراد گھرانے والے کون ہیں ؟ وہ جن کی تمام قوت سعی صرف دنیا کی زندگی سنوار نے ہی میں کھوئی گئی اور جہل حقیقت نے ان میں یہ گھمنڈ پیدا کردیا کہ بہت سی خوبیوں کا کام کر رہے ہیں ، یہی لوگ ہیں جنھوں نے پروردگار کی آیتوں اور اس کے حضور حاضر ہونے سے انکار کیا، پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور قیامت کے دن انہیں کوئی وزن نصیب نہ ہوگا۔“

دوسری جگہ ارباب کفر کے اعمال یہ بتلائے:

یَعْلَمُوْنَ ظَاہِرًا مِّنَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَہُمْ عَنِ الْاٰخِرَۃِ ہُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ (روم:۷)

”صرف دنیا کی زندگی کا ایک ظاہری پہلو انہوں نے جان لیا ہے اور وہ آخرت کے علاقوں سے بالکل غافل ہوگئے ہیں“

آخرت سے مقصود یہ نہیں کہ دنیا اور دنیا کے اعمال ترک کردیے جائیں ، بلکہ اس کی عملی تفسیر یورپ کی موجودہ زندگی کو سمجھو، جس نے اپنے تئیں صرف دنیا ہی کے لیے وقف کردیا اور اس کے گھمنڈ میں وہ اللہ اور اس کے رشتے کے لیے کوئی وقت اور فکر نہ نکال سکی، نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے وہ چیز تو حاصل کرلی ، جس کا نام تمدّن رکھا گیا ہے، لیکن وہ شے حاصل نہ کرسکی جو انسان کے لیے امن حقیقی کی راہ اور اسلام وسعادت فکری کی صراط مستقیم ہے۔

خداکے پاک رسول ﷺ

تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ان انسانوں کا حال ہے، جن کی بڑائیاں صرف جسم و مادہ تک محدود تھیں لیکن اگر دنیا کے لیے ان کی پیدایش کی یاد میں کوئی تسکین اور راحت نہیں تو وہ ان تمام صفوں سے باہر آجائے گی اور دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے دامن میں پناہ لے گی۔ وہ بانیان مذہب کی عظمتوں کا نظارہ کرے گی۔ وہ خدا کے رسولوں اور اس کے پاک پیاموں کے پیامبروں کو ڈھونڈے گی۔

ہاں ، اگر دنیا ایسا کرے تو یہ فی الحقیقت اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوگا، اس کے دائمی درد اور بے قراریوں کے لیے سکھ اور راحت کی ایک حیات بخش کروٹ ہوگی اور وہ بلاشبہ منزل مقصود کو پالے گی۔ قرآن حکیم نے بھی اس کے دکھ کا یہی علاج بتایا ہے اور جب کہ وہ بادشاہوں ، قومی پیشواؤں ، کاہنوں اور علم ومذہب کے جھوٹے مدعیوں کے دامنِ غرور میں لپٹی ہوئی تھی تو اسے وصیت کی کہ وہ سچائی کے رسولوں اور خدا کے داعیوں کی راہ اختیار کرے اور انہی کی زندگی کو اپنا نصب العین بنائے:

اِہۡدِ نَا الصِّرَاطَ الۡمُستَقِیۡمَ ۵ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (سورة فاتحہ)

”خدایا تو ہمیں صراط مستقیم پر چلا،وہ صراط مستقیم جو تیرے نبیوں ، صدیقوں ، شہیدوں ، صالح بندوں کی راہ ہے۔“

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس میدان میں بھی آکر وہ کون سی زندگی ہے، جس کے اعمال دعوت کے اندر دنیا کو پیامِ امن وسعادت مل سکتا ہے؟

دنیا میں آج جوبڑے بڑے مذاہب موجود ہیں ، وہ علم الاقوام کی تقسیم کے مطابق دو قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں ۔ ایک سیما طیقی (سامی) سلسلہ ہے، جس کے ماتحت یہودی اور مسیحی قومیں اب تک دنیا میں باقی ہیں ۔ دوسرا آرین سلسلہ ہے جس سے گوتم بدھ اور ہندوستان کے تمام داعیان مذاہب وابستہ ہیں ۔

حضرت موسیٰ علیسلم

پھر دنیا کے لیے اگر سب سے بڑا رسول یہودی مذہب کی تاریخ میں ہے، تو وہ حضرت موسیٰ علیسلم کی زندگی اور ان کی پیدائش کو سب سے بڑا واقعہ قرار دے گی،لیکن اگر اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے یہ سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ حضرت موسیٰ علیسلم کے اعمال حیات مقدس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مصر کی ایک جابر و ظالم گورنمنٹ کے پنجے استبداد سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور اسے غلامی کی ناپاکی سے نکال کر جو انسانیت کے لیے سب سے بڑی ناپاکی ہے، حکومت اور امن و عزت کی طہارت تک پہنچا دیا۔

بلا شبہ انھوں نے اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی نسل کے لیے بڑا ہی مقدس جہاد کیا اور یہ ان کایا دگار عالم اسوئہ حسنہ ہے، جس کی دنیا کو تقدیس کرنی چاہیے، لیکن سوا ل یہ ہے کہ انہوں نے تمام دنیا کے لیے کیا کیا؟ دنیا صرف بنی اسرائیل ہی کا نام نہیں ہے[0] غیرالٰہی عبودیت کی زنجیریں صرف بنی اسرائیل ہی کے پاؤں میں نہیں تھیں ، بلکہ کرئہ ارضی کی تمام آبادی کے پاؤں اس کے بوجھ سے زخمی تھے، پس دنیا کے لیے وہی تلوار محبوب ہوسکتی ہے جو صرف فرعون کی ڈالی ہُوئی زنجیریں ہی نہ کاٹے، بلکہ دنیا کے تمام فرعونوں کے تخت اُلٹ دے۔

حضرت موسیٰ علیسلم نے صرف بنی اسرئیل کو غلامی سے نجات دلائی، مگر پُوری دنیا غلامی سے نکلنے کی آرزو مند ہے۔

حضر ت عیسیٰ علیسلم

دُوسرا سب سے بڑا ا سرائیلی مذہب مسیحی تحریک کا ہے لیکن مسیحی دعوت کی تعلیم ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ مسیحیت سے منسوب قومیں جو کچھ کہیں گی ہم اسے حضرت مسیح علیسلم کے نام سے قبول نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیح علیسلم نے کہا کہ میں صرف تو رات کو قائم کرنے آیا ہوں ، خود کوئی

---

[0] دراصل ان کی رسالت کا دائرہ کار ہی ان کی قوم تھی نہ کہ بین الاقوامیت۔

نئی دعوت نہیں لایا (متی ۵:۱۷) انہوں نے تصریح کی میرا مشن صرف بنی اسرائیل کی اصلاح تک محدود ہے۔نیز انهوں نے غیر قوموں میں منادی کرنے سے روکا ہے[٥] اور ہمیشہ اپنے کاموں اور اپنی وصیتوں میں اپنی تعلیم کو اسرائیل کے گھرانے تک ہی محدود رکھا ۔ پس دراصل انھوں نے جو کچھ بھی خدمت کرنی چاہی وہ محض بنی اسرائیل نامی ایک مسخ شدہ قوم کی تھی، تمام دنیا کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

پھران کا ظہور اس وقت ہوا جب روم کی ظا لمانہ حکومت نے شام کے مقدس مرغزاروں کو روند ڈالا تھا اور بت پرست قوموں کی جابر ومستبد گورنمٹیں دنیا کے بڑے حصے کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھیں ،لیکن انھوں نے نہ تو اس ظلم و طغیان کے متعلق کچھ کہا اور نہ اس سے کچھ تعرض کیا۔

مسیحی قومیں اور تعلیم مسیح علیسلم

پہلی صدی مسیحی کے بعد جس قدر مسیحی قومیں دنیا میں آباد ہوئیں ، ان کو حضرت مسیح علیسلم کی تعلیم و دعوت سے کچھ تعلق نہ تھا اور وہ سرتاسر یونان کے ایک تعلیم یافتہ یہودی پولس کے مذہب کی پیروتھیں ۔ پولس نے تمام

---

٥ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور نہ سامریوں کے کسی شہر میں داخل ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا ۔(متی۱۰:۶)

حواریان مسیح علیسلم کے مذہب کے خلاف غیر اسرائیلی انسانوں کوبپتمسادینا شروع کیا اور ا س طرح روم اور یونان کے مختلف جزیروں اور دیہاتوں میں ایک نیا گروہ پیدا کر لیا پس اگر دنیا حضر ت مسیح علیسلم کی طرف جھکنا چاہے گی، تو دنیا کو ان کے کارنامۂ حیات کے لیے بمشکل ایک چوتھائی صدی ہاتھ آئے گی، جس کے اندرا ن کے تربیت یافتہ حواریوں کے اعمال نظر آسکتے ہیں اور یہ چند سال فضائل و محاسن اخلاق کا کیسا ہی عمدہ نمونہ پیش کریں ، لیکن ان میں دنیا کے لیے کوئی پیغام نجات نہیں ۔

پھر اس سے بھی قطع نظر کرو، نتائج کی بحث بعد کو آتی ہے، سب سے پہلے دعوت ، اعلان ، ادعاءاور نفس تعلیم کا سوال ہے، دنیا حضرت مسیح علیسلم کی یاد پر کیونکر قناعت کرے، جب کہ خود انھوں نے دنیا کے لیے کچھ نہ کیا، بلکہ ہمیشہ اسے ٹھکرایا، مردود کہا اور اس کے ساتھیوں کو، اس کے دوستوں کو اور اس سے رشتہ رکھنے والوں کو خدا کی بادشاہت کی مہربانی سے محروم بتلایا، حتیٰ کہ ایک آخری فتویٰ دے دیا” تم خدا اور دنیا، دونوں کی خدمت نہیں کرسکتے (متی ۶:۲۵) اونٹ کا سُوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو”۔ (متی ۱۹:۲۳)

اس سے در گزر کرو اور اس کی بہتر سے بہتر توجیہ جو کر سکتے ہو کر لو اور نیز پولس کی دعوت ہی کو حضرت مسیح علیسلم کی دعوت

تسلیم کرلو اور ان تمام قوموں کو جنہوں نے مسیح علیسلم کے نام پر بپتسمے کاپانی اپنے اوپر چھڑ کا، مسیحی دعوت کا پھل مان لو، لیکن پھر بھی مسیحی تحریک کی پوری تاریخ کا کیا حال ہے؟

مسیحیت کی حکمرانی

جب تک مسیحیت دنیا پر حکمران رہی ، جس وقت تک مسیحی مذہب کا دینی تسلط انسانوں سے اطاعت کراتا رہا اور جب تک کہ مسیحی رہنماؤں کی غلامی سے دنیا نے انحراف نہ کیا، تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت تک اس کا وجود دنیا کے لیے، دنیا کے علم و تمدن کے لیے، آبادی و عمرانی کے لیے، اخلاق و پاکیزگی کے لیے اور ان سب سے بڑھ کر یہ ایک انسان کی فطری حریت اور شرف انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت رہا، جس نے جلایا، ویران کیا، مسمار کیا، قتل کیا، جیل خانے بھرے، زبانوں پر مہریں لگائیں ، انسانی دما غوں کو معطل کیا ، لیکن انسان اور انسانیت کی راستی و ترقی کے لیے چند لمحوں کا بھی ایک دور پیدا نہ کیا۔[1] مشہور مورخ گیزو،

---

[1] یورپ اور امریکہ مسیحیت کے بہت بڑے مراکز ہیں ، کیا ان کی سرگزشت استعمار خواہ اس کی شکل کوئی ہو، ابتدا سے آج تک عالم انسانیت کے لیے خصوصاً کمزور قوموں ، ملکوں اور ملتوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت نہیں بنی رہی؟ اور آج بھی ہر مصیبت کا سرچشمہ یہی استعمار نہیں جس کی وجہ سے امن عالم معرض خطرہ میں ہے؟ پہلے جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) استعمار

سیدیو، لامارے اور ڈریپر اس بارے میں ہمارے لیے بہترین راوی ہیں ۔

لیکن جس وقت سے کہ مسیحیت کی قوت نے شکست کھائی تمدن کا غیر دینی دور شروع ہوا ۔ مذہبی جماعتوں اور مذہبی خلافت (یورپ) کے حلقے غلامی سے یورپ آزاد ہوگیا اس وقت سے یورپ کے موجودہ تمدن کی بنیاد پڑی اور مسیحی قوموں نے ترقی شروع کی۔اگر تم کہتے ہو کہ دنیا کے لیے سب سے بڑی عظمت مسیحی مذہب کے بانی میں تھی،تو خود اس کے بانی ہی نے ہمیں معیار حق و باطل بھی بتلادیا ہے کہ”درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتاہے” (مرقس ۱۹۔۱۶) پس دنیا اگر مسیحی مذہب کی پیدائش کے اندر اپنی خوشی کو ڈھونڈ ے تو اس کو انسان کے امن وسلامتی اور فطرت کی آزادی و سعادت کی جگہ قتل و غارت اور ہلاکت و غلامی کی یادگار کا جشن منانا پڑے گا کیونکہ “مسیحیت” کے درخت کا تو یہی پھل ہمارے سامنے ہے،پھر کیا دنیا اس کے لیے تیار رہے؟

یہ جو کچھ تھا، مسیحی اقوام کی تاریخ قدیم کی بناپر تھا لیکن اگر اس پر گز شتہ دو صدیوں کے واقعات و نتائج کا بھی اضافہ کر دیا جائے جو اقوام یورپ کے اعمال تمدن سے وابستہ ہیں تو دنیا کی مایوسی اور زیادہ درد انگیز ہوجائے۔

پرستوں کی ذاتی اغراض کے باعث برباد ہوئی آج انجمن اقوام متحدہ ویسی ہی حالت سے دوچار ہے۔

آریائی نسل کی دعوتیں

اس کے بعد مذاہب عالم میں آرین نسلوں کی دعوتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ، لیکن افسوس کہ دنیا کے لیے ان کے پاس بھی کوئی پیام سعادت نہیں ۔ عظیم الشان گوتم بدھ کی تعلیم ووصایا کا ماحصل یہ بتلایا جاتا ہے کہ "نجات دنیا کے ساتھ رہ کر حاصل نہیں ہوسکتی" ۔ پس دنیا کو جن لوگوں نے ٹھکرادیا، دنیا ان کے پاس جاکر کیا سکھ حاصل کرے گی؟ پھر اس نے جو کچھ بھی بتلایا اور سکھلایا ہو، لیکن قوموں اور ملکوں کے دائرے ہی میں اس کی دعوت محدود رہی ۔ ہندوستان میں اسے شکست ملی تو جاپان اور چین میں جاکر محدود ہوگئی ۔ پس زمین اپنی اس مصیبت کے لیے جو رقبوں اور ملکوں میں محدود نہیں ، عظیم الشان بدھ سے کیا حاصل کرسکتی ہے؟

ہندوستان کے مذہبی ذخیرے تعلیمات اور ان کی پُرا ثر قدامت کی وقعت سے ہم انکار نہیں کرسکتے ، تاہم دنیا کے لیے ان کے بانیوں کی عظمت کے اندر کیا خوشی ہوسکتی ہے جب کہ کوہ ہمالیہ کی دیواروں اور بحیرہ عرب کی موجوں سے باہر بھی دنیا ہے، مگر ہندوستان کے مذہبی داعیوں نے صرف ہندوستان کے اندر بسنے والوں ہی کو اپنی ہدایتیں سُپرد کیں ۔

نجات و تسکین کا واحد پیام

پس دنیا اگر اپنی نجات کے لیے بے چین ہے تو اس کے لیے راحت اور تسکین کا پیام صرف ایک ہی ہے اور صرف ایک ہی کی زندگی میں ہے۔ اس کا دکھ ایک ہی ہے اس لیے اس کی شفا کے نسخے بھی ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔ اس کا پروردگار ایک ہے جو اپنے ایک ہی آفتاب کو اس کے خشک و تر پر چمکاتا اور ایک ہی طرح کی بدلیوں سے اس کے آباد و ویرانے کو شاداب کرتا ہے۔ اس کی ہدایت و رحمت کا آفتاب بھی ایک ہی ہے اور بہت سے ستارے اس کی روشنی سے اکتساب نور حاصل کرتے ہوں مگر ان سب کا مرکز و مئبد نورانیت ایک ہی ہے۔

قرآن حکیم نے آفتاب کو "سراج" کہا:

وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ (نباء:۱۳)

"اور ہم نے آسمان میں سورج کے چراغ کو بڑا ہی روشن بنایا۔"

اور اسی طرح اس کے ظہور کو بھی "سراج" کہا، جس کی ہدایت و رحمت کی روشنی کرے ارضی کی ظلمتوں کے لیے پیام صبح تھی:

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

(احزاب:۴۵۔۴۶)

"اے پیغمبر اسلام! ہم نے تم کو دنیا کے آگے حق کی گواہی دینے والا، سعادت انسانیت کی خوشخبری پھیلانے والا، اللہ کی طرف اس کے بندوں کو بلانے والا اور دنیا کی تاریکیوں کے لیے ایک چراغ نورانی بنا کر بھیجا۔"

کرۂ ارض کے لیے آفتاب ہدایت

پس تمام کرہ ارض کی روشنی کے لیے یہی ایک آفتاب ہدایت ہے، جس کی عالم تسخیر کرنوں کے اندر دنیا اپنی تمام تاریکیوں کے لیے نوربشارت پاسکتی ہے اور اس لیے صرف وہی ایک ہے جس کے طلوع کے پہلے دن کو دنیا کبھی نہیں بھلا سکتی اور اگر اس نے بھلادیا ہے تو وہ وقت دُور نہیں جب اسے کامل عشق وشیفتگی کے ساتھ صرف اسی کے آگے جھکنا پڑے گا اور اسی کو اپنا کعبہ امید بنانا پڑے گا۔

اس مقدس پیدایش نے دنیا میں ظاہر ہوکر یہ نہیں کہا کہ میں صرف بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے آیا ہوں ، بلکہ اس نے کہا کہ تمام عالم انسانیت کو غیر الٰہی قوموں سے نجات دلانا میرا مقصد ظہور ہے۔ اس نے صرف اسرائیل کے گھرانے کی گم شدہ رونق ہی سے عشق نہیں کیا، بلکہ تمام عالم کی اجڑی ہوئی بستی پر غمگینی کی اور ان کی دوبارہ رونق و آبادی کا اعلان کیا۔ اس نے اس خدا کی محبتوں کی طرف دعوت نہیں دی جو صرف سینا کی چوٹیوں یا ہمالیہ کی گھاٹیوں میں بستا ہے، بلکہ اس رب العٰلمین کی طرف بلایا جو پورے نظام ہستی کا پروردگار ہے اور اس لیے تمام کائنات عالم کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ ہم کو دنیا میں سکندر ملتا ہے جس نے تمام عالم کو فتح کرنا چاہا تھا لیکن ہم دنیا کی پوری تاریخ

میں خدا کے کسی رسول کو نہیں پاتے جس نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا ہو۔

جہانوں کے لیے رحمت

اس کا صرف ایک ہی اعلان ہے جو آغاز خلقت سے اب تک کیا گیا ہے اور اس لیے اگر دنیا نسلوں ، قوموں اور رقبوں کا نام نہیں بلکہ مخلوقات الٰہی کی اس پوری نسل کا نام ہے جو کرۂ ارض کی پیٹھ پر بستی ہے تو وہ مجبور ہے کہ ہر طرف سے مایوسی کی نظریں ہٹا کر صرف اس ایک ہی اعلان عام کے آگے جھک جائے اور صرف اسی کی پیدایش کے دن کو اپنی عمر کا سب سے بڑا دن یقین کرے:

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۱﴾ (فرقان:۱)

”کیا ہی پاک اور برکتوں کا سرچشمہ ہے وہ ذات اس کی جس نے اپنے برگزیدہ بندے پرالفرقان نازل کیا تاکہ وہ قوموں اور ملکوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالموں کی ضلالت کے لیے ڈرانے والا ہو۔“

دنیا میں جس قدر داعیان حق و صداقت کے اعلانا ت موجود ہیں ، اگر دنیا ان کو بھلادے گی تو یہ صرف قوموں اور ملکوں کی سعادت کی فراموشی ہوگی کیونکہ اس سے زیادہ انہوں نے کچھ نہ کہا لیکن اگر ربیع الاول کو اس نے بھلادیا

تو یہ تمام کرہ ارض کی نجات کو بھلا دینا ہوگا کیونکہ ربیع الاول کی رحمت کسی ایک سر زمین کے لیے نہیں بلکہ تمام عالمین کے لیے تھی (یہاں تک جو کچھ حوالہ قلم ہوا، یہ محض ایک تمہید تھی اور اسلام کی رحمت عامہ کا ایک سرسری مطالعہ، لیکن اس کے بعد اصل سوال ہمارے سامنے آتا ہے یعنی اس پیدایش نے دنیا کی حقیقی اور عالمگیر مصیبت کے لئے کیاکیا؟اور انسانیت کی سعادت و ارتقاے فطری کی کیونکر تکمیل کی؟ اس محبث عظیم کا احاطہ و استقصاءتو ممکن نہیں لیکن چند سرسری اشارات آنے والی مجلس میں ملیں گے)۔

ربّ العٰلمین اور رحمۃً للعٰلمین

آ فتاب توحیدو ہدایت

قرآن حکیم نے توحید الٰہی کے داعی کریم علیہ الصّلٰوۃ والتسلیم کو "سراج منیر" سے ملقب کیا اور ان کے خصائص کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾

(احزاب: ۴۵،۴۶)

"اے پیغمبر! بے شک ہم نے تم کو شہادت دینے والا ، بشارت پہنچانے والا ، ضلالت و خبائث سے خوف دلانے والا، راہ الٰہی کی طرف داعی اور ایک نورانی مشعل بنا کر بھیجا ہے۔"

لیکن ایک دوسرے موقع پر آفتاب کو بھی "سراج" کے لقب سے یاد کیا ہے:

وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِیْہِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ (نوح: ۱۶)

"اور آسمان میں خدانے چاند کوبھی بنایا ، جو ایک نور ہے اور سورج کو بھی بنایا کہ وہ ایک روشن مشعل ہے۔"

اس مماثلت اور اشتراک تشبیہ سے مقصودیہ تھا کہ اسلام کی دعوت بھی اس آفتاب مادی کی طرح ایک آفتاب روحانی ہے ۔ آفتاب جب نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز نزدیک و دور، اعلیٰ وادنیٰ، سیاہ و سفید، باغ و دشت کی نہیں ہوتی۔ اس کی روشنی بلاتمیز مکان و مقام ہرشے پر چمکتی اور ہر حرارت پذیر و جود کو گرم کرتی ہے۔ بعینہ یہی حال اس آفتاب دعوت الٰہی اور نیر درخشان سمائے رسالت کے عموم فیضان بخشی کا تھا، جو گو سعیر سے چلا ، مگر فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا جس کی کرنوں میں دہنی جانب شریعت الٰہی کی " نُوۡ رٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ" (مائدہ- ۱۵) تھی مگر بائیں جانب قیام عدل و میزان کی شمشیر آبدار چمک رہی تھی جس کا طلوع کائنات میں ظلمت کی شکست اور روشنی کی دائمی فیروزمندی تھا کیونکہ آسمان ہدایت پر شریعت الٰہی کے گو سینکڑوں ستارے نمودار ہوئے تھے لیکن تاریکی کی آخری شکست کے لیے دنیا کو آفتاب ہی کے طلوع کا انتظار ہوتا ہے:

وَ الَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ﴿۱﴾ وَ النَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی ﴿۲﴾ وَ مَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰۤی ﴿۳﴾ (والیل ۱۔۳)

"رات کی قسم ، جبکہ اس کی تاریکی کائنات کی تمام اشیاءکو چھپادیتی ہے اور روز روشن کی قسم ، جبکہ آفتاب کی تجلی تمام کائنات کو روشن کردیتی ہے اور دراصل اس خالق کی قسم، جس نے تخلیق عالم کے لیے نراور مادہ کا

وسیلہ پیداکیا۔“

عالمگیر اخوت واتحاد

اس آفتاب توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق وانشقاق کی تمام تاریکیوں کو مٹادیا۔ اس کی روشنی کی فیضان بخشی میں اسودوابیض اور عرب وعجم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ خدا کی ربوبیت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ "رب العٰلمین" تھا، پس ضرور تھا کہ اس کی راہ کی طرف دعوت دینے ولا بھی "رحمۃ للعٰلمین" ہو:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء۔ ۱۰۷)

"اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا، مگر تمام عالموں کے لیے رحمت قراردے کر۔"

انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی، کہ اس نے رشتۂ خلقت کی وحدت کو بھلا کرزمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کرلیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی، قوموں کے باہمی اختلافات و نزا عات کا گھر بنادیا تھا، لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے، جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں ، بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحادکی دعوت دی اور کہاکہ:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ (حجرات:۱۳)

”اے لوگو ہم دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کردیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ ، ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں ہ امتیاز و شرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔“

صرف ایک رشتہ

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبا ن کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتاہے “وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ”(الروم۔۲۲) لیکن اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا ہ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں ، اصلی رشتہ صرف ایک ہے وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگر چہ سمندروں کے طوفانوں ، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں ، زمین کے دُور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کردیا ہو:

وَ اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝۵۲ (مومنون: ۵۲)

”بیشک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں پس (انکار و

بدعملی کے نتائج سے) ڈرو“

مقام محمود

آیت ۷۹ (بنی اسرائیل[9]) میں مقام محمود سے مراد ایسا درجہ ہے جس کی عام طورپر ستایش کی جائے فرمایا: کچھ بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچادے جو عالمگیر اور دائمی ستایش کا مقام ہو۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب پیغمبر اسلام کی مکی زندگی کے آخری سال گزررہے تھے۔ مظلومیت اور بے سروسامانی اپنے انتہائی درجوں تک پہنچ چکی تھی، حتیٰ کہ مخالفین قتل کی تدبیروں میں سرگرم تھے۔ ایسی حالت میں کون امید کرسکتا تھا کہ ابھی مظلومیتوں سے فتح و کامرانی پیدا ہوسکتی ہے؟ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانیٰی کی بشارت نہیں دی، کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہ تھی بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبردی جونوع انسانی کے لیے عظمت وار تفاع کی سب سے آخری بلندی ہے۔ یعنی عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ حسن و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر

---

[9] وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ٭ عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ (بنی اسرائیل:۷۹)

”(اے پیغمبر) رات کا کچھ حصہ یعنی پچھلا پہر شب بیداری میں بسر کر، یہ تیرے لیے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے، اللہ تجھے ایسے مقام میں پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو۔“

محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی مرکزیت حاصل ہوجائے گی۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہولیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستایش ہوگی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی۔ محمود یعنی سرتاسر ممدوح ہستی ہوجائے گی۔(بنی اسرائیل۔ ۷۹)

ماشئت قل فیہ، فانت مصدّق
فالحب یقضی والمحاسن تشهد!

انسانی عظمت کی انتہا

یہ مقام، انسانی عظمت کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ۔ انسان کی سعی وہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑجاسکتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں پاسکتی کہ روحوں کی ستایش دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔ سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد و ملک کی ستائش اسے نہ دلاسکیں اور نپولین کی ساری جہاں ستانیاں اتنا بھی نہ کرسکیں کہ کورسیکا کے چند غدار باشندوں ہی میں اسے محمود و ممدوح بناتیں ، جہاں وہ پیدا ہواتھا۔ محمودیت اسی کو حاصل ہوسکتی ہے۔ جس میں حسن وکمال ہو، کیونکہ رُوحیں حسن ہی سے عشق کرسکتی ہیں اور زبانیں کمال ہی کی ستایش میں کھل سکتی ہیں ، لیکن حسن و کمال کی مملکت ، وہ

مملکت نہیں جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کرسکیں ۔

زبانوں کی ستائش اور روحوں کا احترام

غور کرو، جس وقت سے نوع انسانی کی تاریخ معلوم ہے ، نوع انسانی کے دلوں کا احترام اور زبانوں کی ستایش کن انسانوں کے حصے میں آئی ہیں ؟ شہنشاہوں اور فاتحوں کے حصے میں یا خدا کے ان رسولوں کے حصے میں جنھوں نے جسم و ملک کو نہیں روح و دل کو فتح کیا تھا؟

یہی مقام محمود ہے جس کی خبر ہمیں ایک دوسری آیت میں دی گئی ہے اور خبر کے ساتھ امر بھی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۵۶﴾ [1]

(احزاب :۵)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا ایک مشہور وہ معاملہ ہوگا، جو قیامت کے دن پیش آئے گا، جبکہ اللہ کی حمد و ثناءکا علم آپ بلند کریں گے اور بلاشبہ محمودیت کا مقام دنیا و آخرت دونوں کے لیے ہے۔ جو ہستی یہاں محمود خلائق ہے، وہاں بھی محمود و ممدوح ہوگی۔

---

[1] اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر (علیہ السلام) پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں ۔ اے لوگو جو ایمان لائے تم بھی اس پر صلوٰۃ بھیجو اور سلام، اچھا سلام۔

جامعیت افضلیت رسول اکرم ﷺ

ان آیات کریمہ❷ سے فضیلت و سیادت حضرت ختم المرسلین کایوں اثبات ہوا کہ امت مسلمہ کو ساری امتوں سے بہتر فرمایا اور شریعت محمدیہ کو تکمیل ادیان اور اتمام نعمت قراردیا۔ ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت مستلزم افضلیت مطاع اور نعمت کا اتمام نعم سابقہ سے اعلیٰ و دائم ہونا، حامل و مبلغ نعمت کے اعلیٰ و افضل ہونے پر دلیل ہے۔ اگر آخری شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لیے ان سب سے افضل ہے، اگر آخری امت ساری پچھلی امتوں کے برکات ونعم سے مالامال اور اس لیے ان سب سے امثل و اصلح ہے اور اگرا س طرح شریعت آخری کے ظہور و زمان و مکان و قوام واعمال کی ساری باتیں پچھلی امتوں کی ان ساری باتوں پر فوقیت و فضیلت رکھتی ہیں تو یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ امت آخری کا رسول ومقوم بھی سارے پچھلے رسولوں کے مراتب ومقامات کا جامع اور اس لیے ان سب سے افضل و مافوق اور "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری" کا مصداق ہو۔ کتاب و سنت کے نصوص و تفریحات اس بارے میں بے شمار ہیں ۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ (البقرہ۔ ۲۵۳) کی تفسیر میں اس مطلب کو کمال شرح وبسط اور شاید ایک طرز تازہ واستدلال

---

❷ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِیْ الخ، فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَآءِ شَهِيدًا ۔

جدید کے ساتھ لکھا جاچکا ہے اور حقیقت جامعیت رسالت محمدی و جامعیت شریعت اسلامیہ و جامعیت امت مسلمہ اور جامعیت جمیع مایتعلق بہا پر ایک خاص اسلوب نظر سے بحث کی گئی ہے۔[1] باقی رہا "لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ" (البقرہ ۲۸۵) تو وہ معاملہ دوسرا ہے "تفریق بین الرسل" کو مسئلہ تفضیل سے کوئی تعلق نہیں ۔ اسی طرح "لا تفضل علی یونس بن متی وغیر ذٰلک" تو اسی نہی کا مورد و محل بھی دوسرا ہے اور منہی عنہ معاملہ تفضیل میں وہ تکلم یا رائے ہے جو منجر بہ تفریق بین الرسل جس نے تمام امم سابقہ کو گمراہ کیا، نہ کہ نفس تفضیل ۔ کیونکہ "انا سید ولد آدم ولا فخر"اور"آدم ما دون تحت لوائی" کے بعد اورکیا باقی رہ گیا؟پھر قطع نظر قرآن حکیم کے، خود نصوص سنت اس بارے میں بے شمار و معلوم ہیں ۔

رب زدنی علما

آیت۱۱۴[2] (طہ) میں فرمایا : جب تک سلسلہ وحی پورا نہ ہوجائے، اس بارے میں جلدی نہ کر

---

[1] مطلب ہے تفسیر "البیان" میں ۔

[2] فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَـقُّ ۚ وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰٓى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾

" پس ہر طرح کی بلندی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہی جہاندار حقیقی ہے اور جب تک قرآن کی وحی تجھ پر پوری نہ ہوجائے تو اس میں جلدی نہ کرے تیری پکار یہی ہو کہ پروردگار !میرا علم اور زیادہ کرے"

اور منتظر رہے کہ فیضان غیب کی بخششیں کہاں تک مالا مال کرتی ہیں ۔ تیری زبانِ حال کی صداتو یہ ہونی چاہیے کہ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا! یعنی میری تشنگی کی سیرابی کے لیے علم کے یہ سارے دریا اور عرفان حقیقت کی یہ ساری بارشیں بھی کافی نہیں ۔ اے علم کی لاانتہائی اور حقیقت کی ناپید کناری ! اپنی بخششیں اور زیادہ کرے

اس آیت نے واضح کردیا کہ پیغمبر اسلام کے مقام علم و عرفان کی وسعت وعظمت کا کیا حال تھا؟ وہ کسی حد پر بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے کوئی زیادتی بھی زیادتی نہ تھی۔ اس کے لیے ہر اضافہ نئے استفاضہ کا اشارہ تھا۔ اس کے لیے ہرعطیہ نئے عطیہ کا تقاضا تھا۔ وہ یکسر طلب تھی۔ پیہم رب زدنی کا سوال تھی۔ یہ معلوم ہے کہ یہاں مطلوب کی وسعت کے لیے کوئی انتہا نہیں ہوسکتی ، لیکن یہ کیونکر معلوم کیا جائے کہ طالب کی طلب کہاں جاکر منتہی ہوئی تھی۔

کائنات انسانیت پر احسان عظیم

حضرت رحمۃللعٰلمین ﷺ نے کائنات انسانیت پر جو لاتعدد لاتحصٰی احسان کیے، ان کا استقصاءکون کرسکتاہے؟ ان میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ ہرقسم کے تعبدو غلامی اور ذلت و تحقیر کی زنجیریں کاٹ ڈالیں اور سب کے لیے استقلال و حریت ذات و رائے، شرف واحترام

نفس اور مساوات صحیح کی بنیادیں استوار کردیں ۔

دنیا استبداد واستعباد کے عذاب الیم میں مبتلا تھی۔ غلامی کی زنجیروں نے اس کابند بند جکڑ رکھا تھا۔ فرمانرو ایانِ ملک ، امرائے شہر ، روسائے قبائل اپنے اپنے حلقے فرما نروائی میں "اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللہِ" (آل عمران: ۶۴)تھے اور ان کے اطاعت گزار اور پیروان کے ہاتھ بالکل مثل معدوم الا رادہ آلات عمل کے تھے، جن کی زندگی کا موضوع و احد صرف اپنے قادر قابض کی تکمیل ہو اسے نفس و اتباع مرضات کیا؟

مسیح علیسلم سے سترہ سو برس پہلے ذات شاہی ہر تقدیس سے متصف ، ہراحترام فوق العادہ سے مقدس اور ہرنقص و عیب سے مبرا تھی۔ خدا کا سایا کم ازکم مرتبہ انسانیت سے ایک بالاتر شے ضرور تھی۔

فراعنہ مصر دیوتا تھے۔اسی لیے مصر کے فرعون نے مسیح علیسلم سے سترہ سو برس پہلے اپنے درباریوں سے کہاتھا "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" (النازعات۔ ۲۴)یعنی موسیٰ کا خدا کون ہے ؟ تمہارا بڑا خدا تو میں ہوں ۔ کلدانیوں کے ملک میں نمرود بابل کی پرستش کے لیے ہیکل بنتے تھے۔ ہندوستان کے راجا دیوتاؤں کے اوتاربن کر زمین پر اترتے تھے۔ ردمہ کا پوپ "خدا کے فرزند" کا جانشین اور اس کا آستانہ مقدس سجدہ گاہ ملوک وسلاطین تھا۔

روم کے قیصر اور فارس کے کسری گودیوتا نہ

تھے لیکن فطرت بشریت سے منزہ اور مرتبہ انسانیت سے بالاتر تھے، جن کے سامنے بیٹھنا ممنوع، جن کے نام لینا سوءِ ادب، جن کے سامنے ابتدائے کلام گناہ اور جن کے سامنے ادنیٰ سا اعتراض بھی موجب قتل تھا۔

دنیا اسی تعبد و غلامی اور ذلت وتحقیر میں اسیر تھی کہ بحراحمر کے سواحل پر ریگستانی سرزمین میں ایک "عربی بادشاہ" کا ظہور ہوا، جس نے معجزانہ زور و توانائی سے قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیئے۔ بابا ئے رومۃ الکبریٰ کے ایوان مقدس کی بنیادیں ہلادیں ۔ تعبد و غلامی کی زنجیریں اس کی شمشیر غیر آہنی کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں ۔ استقلال ذات وفکر، حریت خیال ورائے، شرف واحترام نفس، مساوات حقوق، ابطال شہنشاہی کی روشنی دنیائے قدیم کے قلب سے نکل کر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ شاہان عالم مرتبہ قدوسیت و معصومیت سے گرکر عام سطح انسانی پر آگئے اور عام انسان سطح غلامی و حیوانیت سے بلند ہوکر مصرو بابل کے دیوتاؤں اور روم و ایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوگئے۔

دینِ رحمت

اسلام دین رحمت ہے ۔ اس دین کی کوئی بھی مشق ایسی نہیں ، جو عالم انسانیت کے لیے بلا لحاظ نسل و خون ، بلا امتیاز رنگ و نسب اور بلا قید مقام و محل یکساں پیامِ رحمت نہ ہو

سب سے پہلے اصولی اعتبار سے غور کیجیے۔ دنیا میں ہر نیک و بد کے لیے مہلت حیات اور فیضان معیشت کا انتظام موجود ہے، البتہ اس نظام سے استفادہ ہر فرد کی ہمت، صلاحیت اور جدو جہد پر موقوف ہے۔ کیونکہ:

زندگی جہد است واستحقاق نیست

قدرت نے گوناگوں نعمتوں کے لامتنا ہی خزانے جا بجا مہیا کر رکھے ہیں ۔ اچھے بُرے تمام انسان ان سے فائدہ اٹھانے کے مجاز ہیں ۔ جزائے اعمال آخرت پر اٹھا رکھی گئی ہے۔ یہ اسی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ یہاں رحمت کی کار فرمائی ہے:

رحمت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے فیضان و بخشش میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہواور مہلت حیات پوری طرح سب کو ملے۔ اس نے انسانوں کی انفرادی زندگی کے دو حصے کر دیے۔ ایک حصہ دینوی زندگی کا ہے اور سراسر مہلت ہے۔ دوسرا حصہ مرنے کے بعد کا ہے اور جزا کا معاملہ اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

قرآ ن مجید کا ارشاد ہے:

وَ رَبُّکَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ یُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ یَّجِدُوْا
مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾ (کہف:۵۸)

” تیرا پروردگار بڑا بخشا یش گر اور رحمت والا ہے۔اگر وہ لوگوں کو ان کے عمل کی کمائی پر پکڑتا تو فوراً عذاب نازل کردیتا۔لیکن ان کے لیے ایک میعاد ٹھہرادی گئی ہے۔جب وہ نمودار ہوگی

تو اس سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ انہیں نہ مل سکے گی۔"

مہلت بجائے خود رحمت ہی کی دستاویز ہے تاکہ نیک زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائیں اور برائیوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کواعمال بد سے توبہ کی مہلت حاصل رہے۔عمل بد کا ارتکاب ہوتے ہی عذاب نازل ہوجاتاتو مہلت کہاں رہتی؟ یادرکھیے کہ اصلاح و درستی کا طریقہ یہی ہے اور اصل نصب العین اصلاح و درستی ہی ہے نہ کہ عذاب۔ عذاب تو ان کے لیے ہوسکتا ہے جو سمجھانے بجھانے ،آگاہ کرنے اور مہلت دینے کے باوجود فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے غلط مسلک پرقایم و استوار رہیں ۔

جرموں اور گناہوں کی نوعیت یا کمیت و کیفیت کیسی ہی ہو، جب توبہ و انابت کے احساس میں جنبش نمودار ہوتی ہے اور غفلت وبے حسی کا خواب سنگیں ٹوٹتا ہے تو رحمت قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور توبہ کرنے والے کے نامہ اعمال کی سیاہی اس طرح دُھل جاتی ہے۔ گویا اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوا تھا یہ بھی سراسر رحمت ہی کی کار فرمائی کا ثبوت ہے۔

قرآن مجید ہر بندے کو رحمت کی بشارت پہنچا رہا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی برے اور مکروہ کیوں نہ ہوں :

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

اِنَّ اللہ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا (زمر: ۵۳)

”اے میرے بندو! (جنہوں نے برائیوں کے ارتکاب سے) اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا۔“

اسلام کے ضوابط

اسلامی ضوابط کی غرض و غایت یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی ہر قسم کے اختلال سے محفوظ رہے اور معاشرے میں فتنہ و فساد پیدا نہ ہونے پائے، جو اجتماعی زندگی کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتا ہے۔ ویسے ہر مجموعہ و ضوابط کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے دو باتیں بطور خاص پیش نظر رہنی چاہیئے:

۱۔ آیا اجتماعی زندگی کے لیے قوانین بنانے کے سلسلے میں جائز انفرادی انسانی حقوق کا پُورا لحاظ رکھا گیا؟ ایسا نہ ہوتو جائز انفرادی حقوق اور اجتماعی قوانین میں تصادم کی نوبت آتی رہے گی اور ان حالات میں کوئی معاشرہ اختلافات سے، زیادہ عرصے تک محفوظ نہ رہ سکے گا۔

۲۔ اجتماعی قوانین کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ افراد کے درمیان باہم محبت، رحمت اور رافت کو فروغ حاصل ہو؟ جس سے اجتماعی زندگی کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوجائیں گی۔ افراد اجتماعی نظام کے عقیل، فہیم ، عاقبت اندیش اور حق شناس

کارکن بنے رہیں گے، ان میں ایک دوسرے کے حقوق کی حدوں کا اندازہ کر لینے کی تمیز زیادہ قوی ہوتی جائے گی اور ایک دُوسرے کا زیادہ سے زیادہ لحاظ ان کی فطرت ثانیہ بن جائے گا۔

اسلام ایسے ہی معاشرہ پیدا کر دینا چاہتا تھا، اس کے مجموعۂ ضوابط(جن میں اخلاقی تلقینات بھی شامل ہیں) کا اصل مقصد یہی تھا کہ انسانوں میں ذمّہ داری کے احساس کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے ، جس کے بعد کسی احتسابی نظام کی ضرورت بھی محض برائے نام رہ جائے۔ ابتدائی دور کی مربیا نہ سیاست میں اس مقصد کی تکمیل یقینا بہت قریب نظر آنے لگی تھی۔ لیکن حالات نے یکایک پلٹا کھایا اورمربیانہ سیاست کی جگہ ملو کی نظام نے لے لی ۔ پھر جو صورت حال پیش آئی اس کا مرقع صدیوں سے ہر حساس فرد کے لیے دل کاناسُور ہے۔ ۔ سب سے بڑھ کر اندوہ و قلق کی بات یہ ہے کہ بیشترنعرے اسلام کے لگائے جاتے ہیں اور پیش نظر وہی پیمانے ہوتے ہیں ، جو دورِ ملوکیت میں فروغ پذیر ہوئے۔

باہم سلوک کی مثالیں

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تری المومنین تراحمھم وتوادّھم و تعاطفھم کمثل الجسد اذا شتکیٰ عضو تداعیٰ لہٗ

سائرُ جسدہ بالسَّھَرِ و الحُمّٰی [1]

”تومومنوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کے اعضا کی طرح دیکھو گے جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے پورا جسم بے خوابی اور بخار کی دعوت بن جاتا ہے۔“

آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آیا آپس میں اس رحم ، اس محبت اور اس مہربانی کی عملی مثالیں آپ کو کسی طرف نظر آتی ہیں ؟ الاّ ماشاءاللہ ، یا ہمارے گردو پیش ایسا کوئی نظارہ روح و قلب کے لیے سرور شادمانی کی بشارت بن سکتا ہے؟

۲۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

واللّٰہ لا یومن واللّٰہ لا یومن واللّٰہ لا یومن قیل و من یا رسول اللّٰہ ﷺ قال الذی لا یامن جارہٗ بوائقہٗ [2]

”اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، کسی نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ ـ کون؟ فرمایا جس کا ہمسایہ اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔“

غور کریں کہ اگر ہر ہمسایہ حضور ﷺ کے اس ارشاد پر عمل پیرا ہوجائے، ہر لحظہ خیال رکھے کہ اس کی کسی حرکت سے ہمسایہ کو تکلیف نہ پہنچے تو پوری آبادیاں نہ محض ہر قسم کے شر سے پاک ہوجائیں بلکہ تمام باشندوں میں ایک دوسرے کے متعلق انتہائی محبت و احترام کے جذبات پیدا ہوجائیں حالانکہ یہ بظاہر ایک جزوی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب باب رحمۃ الناس و البہایم۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب باب اثم من لایا من جارہ۔

ارشاد ہے تاہم اس کی عملی صورت پر غور کریں تو اس کی وسعت اور اثر خیر کا اندازہ کرنا مشکل ہوجائے گا۔

یہ اسلام تھا جو دنیا کے لیے رحمت و رافت اور برکات وسعادت کی بشارت لے کر آیا تھا۔ کیا اس سے کسی کے لیے داعی اسلام ﷺ کی "رحمۃ اللعٰلمین" کا اندازہ کرلینا مشکل ہے؟

اشرف المخلوق کے واجبات

انسان کو اشرف المخلوق قرار دیا جاتا ہے۔ کیا اس لیے کہ اس پر فخر و مباہات کی سرشاری میں واجبات کو نظر انداز کردیا جائے؟ انسان نیک و بد کی تمیز سے بہرہ مند ہے۔ آگ اور پانی میں فرق کرسکتا ہے۔ پھر کیا اس سے کوئی ایسی حرکت یا کوئی ایسا عمل سرزد ہونا چاہیے ، جو انسانیت کے حسن اور شرف کے منافی ہو اور جو ا سے "اسفل سافلین" میں پہنچادے ؟ یعنی جس سے ہم جنسوں کے طبعی و فطری حقوق پر زد پڑے ، خواہ ان کا تعلق ہم جنسوں کی جانوں سے ہویا اموال سے یا آبروؤں سے؟ ایسا ہر فعل لازماً اجتماعی امن وراحت کے نظام میں کم یا زیادہ اختلال کا باعث ہوگا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے اختلال انگیز افعال و حرکات سے احتراز حقیقتاً ہر فرد کے لیے ضروری ہے کیونکہ اگر زید کی کوئی حرکت کسی وقت بکر اور اس کے ساتھیوں کو نقصان پہنچائے گی تو دوسرے موقع پر بکر یا اس کے

ساتھیوں کی ایسی ہی حرکت خود زید یا اس کے ساتھیوں کے لیے موجب آزار ہوگی۔

اسلام کی برتری یہ ہے کہ اس کے تمام اوامرونواہی کی بنیادو اساس معاشرے میں رحمت و محبت جاری و ساری رکھنے کے لیے ہے۔ وہ چاہتا ہے رحمت و محبت کے فروغ و عمومیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔تمام افراد معاشرہ کے درمیان اخوت ، خلوص ، ہمدردی اور یکجہتی کے روابط زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوں ، یہ سب رحمت ہی کی کار فرمائی کے عوامل ہیں ۔

محبوب معبود

غرض اسلام نے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قایم کیا ہے، اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت اور محبت ہی پر رکھی ہے، قرآن مجید کی مختلف تصریحات کے مطابق خدا اور بندوں کے درمیان بھی رشتہ محبت ہی کا ہے۔

سچی عبودیت ہے اسی کی عبودیت جس کے لیے معبود صرف معبود ہی نہ ہو، بلکہ محبوب بھی ہو۔ اسی لیے فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (بقرۃ۔ ۱۶۵)

”اور جو لوگ ایمان والے ہیں ، ان کے دلوں میں تو سب سے بڑھ کر چاہت اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔“

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱

(آل عمران:۳۱)

”(اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ

سے واقعی محبت رکھتے ہو تو چاہیے کہ میری پیروی کرو (کیونکہ میں تمہیں اللہ سے محبت کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا وہ بڑا ہی غفور و رحیم ہے۔“

حبّ رسول ﷺ

خود رسول اللہ ﷺ کی ذات با برکت سے محبت بھی اسی لیے دنیا بھر کے انسانوں پر فایق و برتر ہوگئی کہ ان کے ذریعے سے ہمیں خدا کا راستہ ملا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ و الناس اجمعین۔[1]

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک حقیقی مومن نہیں ہوسکتا، جب تک میں اس کے نزدیک باپ ، بیٹے اور پُورے عالم انسایت سے محبوب تر نہ ہوجاؤں ۔“

رسول اللہ ﷺ جو نور ہدایت لے کر آئے ، اس کے سوا ہدایت کا کوئی وجود نہیں اور انسان کے لیے سب سے پہلی چیز ہدایت حق ہے، اس کے بعد تمام رشتے آتے ہیں اور خود رشتوں کے واجبات نیز ان کی تکمیل و سر انجام کے طریقے ہمیں اسی نور ہدایت سے ملے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے ہماری زندگی میں مشعل راہ بنا۔

خدا سے محبت کی عملی راہ

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حب الرسول ﷺ

یہ بھی بتادیا کہ خدائے بزرگ و برتر سے محبت کی عملی راہ خدا کے بندوں کی محبت سے ہو کر گزری ہے۔ جو شخص چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے، اسے چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور حضور ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

قرآن مجید اور احادیث میں خدا کے بندوں سے پیار کے لیے جو کچھ موجود ہے اس کا خاصا بڑا حصہ جا بجا پیش کیا جا چکا ہے اور اعادہ غیر ضروری ہے۔ اس دنیا میں نگرانی اور دیکھ بھال کے محتاجوں کی کوئی صنف ایسی نہیں ، جس کے لیے مختلف صورتوں میں انفاق کے احکام موجود نہ ہوں ۔ عزیزوں اور رشتے داروں کی اعانت ، بیواؤں ، مسکینوں اور اسیروں کی امداد، غلاموں کو غلامی سے چھڑانا، مسافروں کی خبر گیری، قرض کے بوجھ سے دبے ہُوئے لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے سہارا دینا غرض کون سی ضرورت ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا؟ واضح رہے کہ اسیروں سے مراد وہ لوگ نہیں جو جرموں کے ارتکاب کے بعد جیل خانوں میں چلے جاتے ہیں ، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں پکڑے جائیں یا زمانہ ماضی کی طرح اب کوئی ظالم شخص کسی کو گرفتار کرکے اپنا کام لینے لگے۔

جہاں صحیح اسلامی معاشرہ موجود ہو اس کے تمام افراد اپنے واجبات کتاب و سنت کے مطابق پُورے کریں ، وہاں کوئی ایسا محتاج نظر

ہی نہیں آسکتا، جسے کسی کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھنے یا ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہو۔ ارباب استطاعت کا اسلامی جذبۂ خیر نیز محتاج کی اسلامی خود داری اور عزت نفس ، دونوں اپنی جگہ کار فرما ہوں گے۔ پہلے گروہ کے نزدیک انفاق اسی طرح واجب ہے، جس طرح خود اس گروہ کے لیے ذاتی ضروریات پُورا کرنا واجب ہے۔ محتاج کسی سے نہیں لیتا کہ اس کا ممنون ہو، اللہ نے اس کا حصہ مقرر کردیا ہے اور وہ اپنا حصہ لیتا ہے۔ یہ اسلام تھا جو رسول اللہ ﷺ دنیا بھر کے انسانوں کے لیے لائے تھے۔

حضور ﷺ کے چند ارشادات

حضور ﷺ کے بعض ارشادات بھی ملاحظہ کرلیجیے ،فرمایا:

۱۔ خدا کی رحمت انہی بندوں کے لیے ہے جو خدا کے بندوں کے لیے رحمت رکھتے ہیں ۔

۲۔ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

۳۔ جو شخص رحم کرے گا، اگرچہ ایک چڑیا ہی کے لیے کیوں نہ ہو، خدا اس پر رحم کرے گا۔

۴۔ “مَنۡ لاَّ يَرحَمَ لاَ يُرحَمَ۔ ”یعنی جو شخص رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔“

۵۔ ایک اعرابی نے نماز پڑھتے ہُوئے دعا کی کہ اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم کر اور ہمارے ساتھ اور کسی پر رحم نہ کر، جب وہ نماز ادا کرچکا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تو نے بہت

وسعت والے کا دروازہ تنگ کردیا۔

اعرابی نے یہ دُعا بُری نیت سے نہیں کی تھی، اس کے تصورات ہی اس قسم کے تھے، حضورؐ نے سمجھا دیا کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ تمام انسانوں کے لیے بھلائی مانگنے سے بھی اس کی رحمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

صفات الٰہی کا پرتو

انسانیت کی تکمیل یہ ہے کہ صفات الٰہیہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تشبہ پیدا کیا جائے یعنی اتنا تشبہ جتنا انسان کے بس میں ہو۔ ان صفات کا عکس انسان کے آئینۂ فکر و عمل میں ٹھیک ٹھیک اتارنے کے لیے کوئی وقیقۂ سعی اٹھانہ رکھنا چاہیے ۔ قرآن مجید ہم میں خدا کی رحمت کا تصور پیدا کرنا چاہتا ہے تو صرف اس لیے کہ ہم بھی سراپا رحمت بن جائیں ۔ اسی طرح قرآن خدا کی ربوبیت، رافت، شفقت اور احسان،نیز دوسری صفات کا نقشہ کھینچتا ہے تاکہ ہم میں بھی بقدر ہمت واستطاعت انہی صفات کا جلوہ نمودار ہو۔

قرآن ہمیں بار بار سناتا ہے کہ خدا کی بخشش و درگزر کی کوئی انتہا نہیں اور اس طرح ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم میں بھی اس کے بندوں کے لیے بخشش و درگزر کا غیر محدود جوش پید ا ہوجانا چاہیے! اگر ہم اس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں کے لیے اس کی بخشایشوں کا

انتظا رکریں ؟۔

یہ آخری فقرہ اس حدیث پر مبنی ہے کہ مَنْ لاَّ یَرحَمَ لاَ یُرحَمَ۔

احکام و شرائع اور تلقینات

جس حد تک احکام و شرائع کا تعلق ہے ، جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُہَا (شوریٰ۔ ۴۰) (برائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی) اپنی جگہ قائم ہے کیونکہ تمام انسان حوصلے اور ہمت میں یکساں نہیں ہوتے اور نہ ہر جرم ایسا ہوتا ہے کہ بخشا جائے تو مرتکب پر یا معاشرے کہ حالات پر بہ ہر حال اچھا اثر پڑے گا۔ تاہم کتاب الٰہی کی تلقینات ہر لحظہ پیش نظر رہنی چاہییں ، جو عزیمت کی متقاضی ہیں مثلاً:

١۔ پھر جس نے درگزر کیا اور معاملے کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ (شوریٰ:۴۰)

۲۔ اور جو کوئی برائی پر صبر کرے اوربخش دے تو یقیناً یہ اولوالعزمی کی بات ہے ۔ (شوریٰ: ۴۳)

۳۔ خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں اللہ کے لیے خرچ کرنے والے، غصے کو پی جانے والے، ہم جنسوں کے قصوربخش دینے والے اللہ کی محبت انہی محسنین کے لیے ہے۔ (آل عمران: ۱۳۴)

۴۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی رضا و خوشنودی کے لیے (تلخی و ناخوشگواری) صابرانہ

برداشت کرلی، نماز قائم رکھی، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے پوشیدہ اور علانیہ (ہمارے بندوں کے لیے)خرچ کرتے رہے اور برائی کا جواب برائی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیا تو یقین کرو کہ یہی لوگ ہیں ، جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے۔(رعد:۲۲)

۵۔ اور اگر تمہیں بدلا چاہیے کہ جتنی اور جیسی برائی تمہارے ساتھ کی گئی، ٹھیک اسی کے مطابق بدلا لو اور اگر تم برداشت کر جاؤ تو صابروں کے لیے برداشت کرلینا ہی بہتر ہے۔ (نحل :۱۲۶)

اللہ کی بے پایاں رحمت

رسول اللہ ﷺ ہی کی ذات گرامی ہے جس کے ذریعے سے خدا ئے قدوس کی بے پایاں اور لا متنا ہی رحمت کی بشارت بندگانِ خدا کو ملی ۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

رَحْمَتِیْ وَ سِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (اعراف : ۱۵۶)

”میری رحمت کا یہ حال ہے کہ ہر شے پر چھائی ہوئی ہے“

صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک موقع پر کچھ قیدی آئے۔ ان میں سے ایک عورت کو بچہ مل گیا، جو اس کا تھا، دیکھتے ہی مامتا کی خاص تڑپ کے ساتھ اس سینے سے لگا کر دُودھ پلانے لگی۔ بچے مل جانے کی خوشی اور دُودھ پلانے کی پُر سرور تسکین سے وہ بظاہر اس درجہ سرشار ہوگئی

کے گرد و پیش اور ماحول کا بھی کچھ خیال نہ رہا۔ رسو ل اللہ ﷺنے یہ کیفیت دیکھ کر فرمایا۔

اترون ھٰذہ طارحۃٌ ولدھا فی النار قلنا: لا وھی تقدران لا تطرحہ ، فقال: اللّٰہ رَاحِمٌ بعبادہ من ھٰذہ بولدھا۔

”تمہارا کیا خیال کہ آیا یہ عورت اپنا بچہ آگ میں ڈال دینے کے لیے تیار ہوجائے گی؟ ہم نے عرض کیا کہ جب تک اس کی طاقت و قدرت میں ہے کبھی نہ ڈالے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ رحیم ہے جتنی یہ عورت اپنے بچے کے لیے ہے۔“

انسانوں ، حیوانوں ، پرندوں ، چرندوں ، درندوں وغیرہ میں سے کسی گروہ کو لے لیجیے، بچے کے لیے ماں کی مامتا سے بڑھ کر پُر خلوص محبت کا نظارہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ حضورﷺنے مامتا کا نظارہ دیکھ کر بندوں کے لیے اللہ کی رحمت کا ذکر فرما دیا اور اس محبت کا نقش لوگوں کے قلوب و ارواح پر جمادینے کی صورت اس کے سوا کیا تھی کہ دنیا کی بہترین محبت سے بہ طور مثال کام لیا جائے۔ حقیقتاً بندوں سے اللہ کی محبت کا صحیح اندازہ پیش کرنے کی دل نشین تر صورت کون سی ہے؟

جزئیات مسائل

اگر آپ بعض امور کے متعلق حضور ﷺ کے ارشادات کی جزئیات سامنے رکھ لیں تو یقین ہے کہ سراپا حیرت زدہ رہ جائیں گے کیونکہ آج تک

کائنات انسانیت کا کوئی بڑے سے بڑا عالم، فلسفی یا کوئی اور شخص ایسا استقصا نہیں کرسکاہے تاہم وہ بیان کردی جائیں تو آپ کے قلب و رُوح سے بے اختیا رصدا بلند ہوگی، بلاشبہ ان میں سے ہر جزئیہ حق ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ پڑوسیوں کے حقوق کی نشاندہی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

۱۔ اگر پڑوسی بیمار ہوتو اس کی عیادت اورخبر گیری کی جائے۔

۲۔ اگر وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کا ساتھ دو یعنی تدفین میں ہاتھ بٹاؤ۔

۳۔ اگر وہ ضرورت مند ہو اور تم میں استطاعت ہو تو اسے قرض دو۔

۴۔ اگر وہ کوئی برا کام کربیٹھے تو اس کی پر دہ پوشی کرو۔

۵۔ اگر اسے کوئی نعمت یا مال ملے تو مبارک باد دو(جس سے دلی مسرت کا اظہار مقصود ہوتا ہے)۔

۶۔ اگر اس پر کوئی مصیبت آپڑے تو اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرو۔

۷۔ اپنے گھر کی عمارت اس طرح بلند نہ کرو کہ پڑوسی کے گھر کی ہوا رک جائے۔

۸۔ جب تمہارے گھر میں کوئی اچھا کھانا پکے تو کوشش کرو کہ تمہاری ہنڈیا کی مہک پڑوسی (اور اس کے بال بچوں تک) نہ پہنچے۔ یہ ان کے لیے باعث ایذا ہوگی یا اپنے اوپر لازم کرلو کہ اس کھانے کا کچھ حصہ پڑوسی کے

گھر بھی بھیجو گے۔

پھر پڑوسیوں کی قسمیں بتائیں یعنی:

۱۔ غیر مسلم جس کے ساتھ رشتہ داری بھی نہیں نچلے درجے کا پڑوسی ہے۔ یعنی اس کے بھی حقوق ہیں ، مگر دوسروں سے کم۔

۲۔ مسلم پڑوسی جس کے ساتھ رشتہ داری نہ ہو،اس کا درجہ پہلے کے مقابلے میں بلند تر ہے۔

۳۔ رشتہ دار مسلم پڑوسی یعنی پڑوسی بھی، مسلم بھی اور رشتہ دار بھی، یہ سب سے اونچے درجے پر فائز ہے۔ آپ کو ان جزئیات کی کوئی مثال کسی دوسری جگہ مل سکے تو مہربانی فرما کر پیش کردیجیے۔ اور یہ صرف ایک مسئلے کے متعلق ہے۔ ہر مسئلے میں آپکو ایسی ہی جزئیات ملیں گی جو سامنے آجائیں تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی واقعی جزئیات ہیں ، ورنہ کسی کی نظران گہرائیوں پر جا ہی نہیں سکتی۔

بنیادی امر

یہ پاک دین تھا، جس کی دعوت کے لیے رسول اکرم ﷺ مبعوث ہوئے اسلام کا خدا رؤف و رحیم، اسلام کا رسولؐ رؤف و رحیم،اسلام کے پیروؤں کو زیادہ سے زیادہ رحمت و محبت، شفقت اور عفوو درگزر کی تعلیم دی گئی تھی۔ عالم انسانیت کی اصلاح و درستی کا کا راہم اسی طرح بوجہ احسن پُورا ہوسکتا تھا۔ بلاشبہ بدلے

کی گنجائش رکھی گئی، کیونکہ تمام انسان عزم الامور کی ترازو میں پُورے نہیں اُتر سکتے، لیکن ترجیح عزم الامور ہی کو حاصل ہے اور مقاصد اصلاح و درستی کو جلد سے جلد پایہ تکمیل پر پہنچانا بھی عزم الامور ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ اصلاح کے سلسلہ میں بنیادی امر یہ ہے کہ جن کی اصلاح مقصود ہو ، انھیں سب سے پہلے یہ یقین ہوجائے کہ ان کے ساتھ داعی اصلاح کو دلی ہمدردی ہے۔ یہ یقین داعی کے بلند طرز عمل ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ جیسے جیسے دائرہ اصلاح پھیلتا جائے گا فتنہ و فساد کا ازالہ ہوتا جائے گا ۔ نئے نئے داعی بروئے کار آئیں گے ۔ اس طرح رحمت خداوندی سے کیا بعید ہے کہ کروڑوں انسان تھوڑے ہی عرصہ میں راہ حق پر لگ جائیں ۔"يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" (النصر۔ ۲) کا ایک منظر وہ تھا جس نے رسول ﷺ کی ذات بابرکات کے معبوث ہونے کی ضرورت پوری کردی۔ "يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" کا آخری منظر ابھی باقی ہے۔ جب شش جہت سے اعتراف رحمۃ للعٰلمین کی صدائے حق بلند ہوگی اور کائنات انسانیت کے لبوں پر اللّٰھم صل علیٰ سیّدنا و مولانا محمدٍ وّ آلہ وسلم کا ترانہ ہوگا۔

عظیم ترین محسن انسانیت

آپ نے کبھی سوچا کہ خونی رشتہ سے بڑھ کر سچی، پر خلوص اور مستحکم محبت پیدا کرنے کے مؤثر ترین وسائل کیا ہیں ؟ حضور ﷺ کے بعض

ارشادات پر ایک سرسری نظر ڈال لیجیے آپ کو یقین ہوجائے گا کہ انسانیت پر اس بنیادی اور دوامی احسان کے لیے جو طریقہ حضورﷺ نے اختیار فرمائے۔ ان سے بہتر اورحصول مقصد کے لیے مؤثر ذریعہ کوئی نہیں ہوسکتا ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا:

”بدگمانی سے دور رہو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو، عیب جوئی نہ کرو، باہم بغض نہ رکھو اور بھائی بھائی ہوجاؤ۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

” آپس میں بغض نہ رکھو،باہم حسد نہ کرو، آپس کے تعلقات نہ توڑو اور خدا کے بندو! بھائی بھائی ہوجاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین روز سے زیادہ قطع تعلق رکھے”۔[2]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

” رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، جب تم میں سے کسی کے ہاں سالن پکے تو اسے چاہیے کہ شوربا زیادہ کر لے۔ پھر اس میں سے کچھ پڑوسی کو بھی بھیج دے”۔[3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق

---

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح باب لا یخطب علیٰ خطبۃ اخیہ۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب باب ماینھیٰ عن التماس

[3] رواہ الطبرانی الاوسط۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا (یعنی میری جماعت میں سے نہیں) جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر مزے سے سوجائے جب اس کے پہلو میں رہنے والا پڑوسی بھوکا ہو اور پیٹ بھر کر سوجانے والے کو علم ہو کہ پڑوسی بھوکا ہے۔“ [1]

آج رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے کتنے مدعی ہیں جو حقیقی ایمان کی اس میزان میں پورے اتر سکتے ہیں ؟ جو لوگ محض اتفاقات کی بنا پر کچھ عرصے کے لیے امروحکم میں شریک ہوجاتے ہیں ، وہ اپنے عالی شان ایوانوں میں اس طرح پیٹ بھر کر سوتے ہیں کہ لاکھوں بھوکوں اور محتاجوں کا احساس تک انھیں نہیں رہتا۔ احساس ہو تو تڑپ کر باہر نہ نکل آئیں ؟ احساس ذمہ داری ان کو تھا جو راتوں کو جگہ جگہ خفیہ خفیہ دورے کرکے اندازہ کیا کرتے تھے کہ کوئی ستم زدہ ان کے دائرہ علم سے باہر تو نہیں رہ گیا؟ پھر دیکھیے ارشاد کا مدعا جہاں یہ ہے کہ مختلف انسانی حقوق کا پورا پورالحاظ رکھا جائے وہاں یہ بھی ہے کہ ان میں وہ محبت وہ رحمت اور وہ شفقت بروئے کارآجائے، جو خونی رشتوں میں بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ اگر انسانیت کا کوئی محسن اس عظمت و شان کا ہے تو اس کا نشان بتائیے۔ یہ منصب ازل سے رحمۃ للعٰلمین ﷺ کے لیے خاص ہوگیا۔

---

[1] رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

اُسوۂ محمدی ﷺ

احتساب

احتساب ایک سنہری زنجیر ہے،جس میں تمدن،اخلاق،مذہب اور معاشرت کی تمام جزئیات جکڑی ہوئی ہیں ۔اگر اس کی بندش ڈھیلی پڑجائے تو دفعۃً نظام عالم کی ایک ایک کڑی درہم برہم ہوجائے۔ اسی غرض سے دنیا نے احتساب کو مختلف صورتوں میں قایم رکھا۔ خاندانوں اور کنبوں نے مختلف رسم و رواج اختیار کیے،جن کی خلاف ورزی موجب ملامت، بلکہ بعض اوقات قوی جرم خیال کی جاتی ہے، سلطنتوں نے قوانین بنائے جو انسان کو ایک خاص نظام کے ماتحت ہر قسم کی مادی،اخلاقی اور مذہبی ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں ۔ حکماءنے فلسفۂ اخلاق ایجاد کیا،جو اخلاقی قوانین کی پیروی پر جمعیتِ بشری کو مجبورکرتا ہے۔

ہمارا سرمایۂ فخر

اگر یورپ کو اپنی تہذیب پر فخر ہے کہ وہ انسان کی ہر فر و گزاشت پر سختی کے ساتھ گرفت کرتی ہے۔ اگر رومن لا (رومی قانون) کو

اپنے اوپر ناز ہے کہ وہ دنیا کے قوائے متضادہ کو اپنے مرکز سے ہٹنے نہیں دیتا، اگر یونان کو اپنے فلسفہ اخلاق پر گھمنڈ ہے کہ وہ اخلاقی قویٰ کی تربیت کرتا ہے تو ہمیں ان کے بڑے بول سے مرعوب نہیں ہوجانا چاہیئے۔ہم رسم و رواج کے غلام نہیں کہ یورپ کے قوانین معاشرت پر فریفتہ ہوجائیں ۔ ہم قانونی سختیاں برداشت کرنے کے خو گر نہیں کہ اپنے ہاتھ کو ہر ہتھکڑی کے حوالہ کردیں ۔ قیا سات عقلی ہماری غذائے روحانی نہیں کہ یونانیوں کے طلسم میں پھنس جائیں ،بلکہ ہمارے رگ اور پٹھے ایک پاک مذہب کے سلسلہ میں جکڑے ہوئے ہیں ۔ ہمارے گوشت اور خون پرچمڑے کی جگہ مذہب کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ہمارے قلب کو ایک غیرمتزلزل مذہبی احساس حرکت دے رہا ہے،پس ہم کو ہر دلفریب رسم و رواج،ہر مرعوب کرنے والے قانون اور ہر متحیر کر دینے والے فلسفے کو چھوڑ کر اپنی باگ صرف اسلام ہی کے ہاتھ میں دینی چاہیے اور اس پر فخر کرنا چاہیے کہ :

رشتہ در گرونم افگندہ دوست
مے برد ہر جاکہ خاطر خواہ اوست

اسوۂ حسنہ

مذہب کی قوت احتساب ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر

آنحضرت ﷺ کا اتباع فرض کرکے ہم کو پوری دنیا کی مادی و اخلاقی غلامی سے آزاد کردیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب : ۲۱)

”یقینا تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں پیروی و اتباع کا بہترین نمونہ رکھا گیا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا : کہ تم رسول اللہ کی تقلید کرو، کیونکہ ایک کی تقلید کرنے سے دوسرے اشخاص کی تقلید کی نفی نہیں ہوجاتی، بلکہ یہ فرمایا کہ تمہاری تقلید صرف اسی پاک ذات میں محدود ہے کیونکہ تمہیں اعمال صالحہ کا یہ خزانہ دوسری جگہ نہیں مل سکتا ۔ اس طرز بیان سے نہ صرف جناب رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازم کردیا گیا، بلکہ ساتھ ہی دوسرے تمام بڑے بڑے انسانوں کے اتباع کی نفی بھی کردی۔ اس لیے کہ صرف ایک ہی آفتاب ہے جس کی روشنی ، ظلمت زاردنیاکی ہراندھیری اور ہرتیرہ و تاریک راہ میں ہماری رہنمائی کرسکتی ہے!

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
(مولانا رومؒ)

آیات و احادیث

اسی آفتاب کی روشنی سے اور سیارے بھی نور حاصل کرتے ہیں ، اس لیے ان کا اتباع بھی ہم پر واجب ہوجاتا ہے:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم

”بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے اس کے بعد ان لوگوں کا دور جو اس کے بعد آئیں گے، پھر وہ لوگ جو اس کے بعد اسوہ حسنہ کی تقلید کریں گے۔“

اصحابی کا لنجوم

”میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں “۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جناب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی اس خصوصیت کا بار بار ذکر کیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۱۵۷ (اعراف:۱۵۷)

” جو رسول اور نبی امّی کی پیروی کریں گے، جس کی بعثت تو راۃ و انجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انہیں نیکی کے کاموں کا حکم دے گا برائیوں سے روکے گا۔ پاک و مفید چیزوں کو ان پر حلال اور ناپاک و مضر چیزوں کو حرام کرے گا۔“

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(آل عمران:۱۱۰)

”تم لوگ بہترین امت ہو جسے خدانے دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نمایاں کیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور خداپر ایمان لاتے ہو“

لیکن ان آیتوں کی عملی تفسیر ہمیں صرف احادیث کی کتابوں میں ڈھونڈنی چاہیے جن کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ اورصحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مواقع احتساب کے ایک ایک جزیے کا پتا لگ سکتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدانے ہدایت و ارشاد کے لیے جو آفتاب اور سیارے پیدا کیے تھے، وہ ہمیشہ ضیا گستر رہتے تھے۔

احتساب کی ترتیب اصلاح نفس سے شروع ہوکر بالترتیب محتسب کے قبیلے اور قوم تک منتہی ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرض احتساب اسی ترتیب کے ساتھ ادا فرمایا۔

اصلاح نفس

آنحضرت ﷺ کی ذات پاک جامع فضائل تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے تمام زلاّت کو معاف کردیا تھا، باایں ہمہ آپ ﷺ اس کثرت سے نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں پھول کر پھٹ جاتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس ریاضت شاقہ کو دیکھ

کر عرض کیا، یارسول اللہﷺ !۔ خدانے تو آپﷺ کے تمام اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کردیا ہے، پھر آپﷺ کیوں اس قدر مصروف عبادت رہتے ہیں ؟ آپﷺ نے فرمایا:

افلا اکون عبداً شکورا[1]

”کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ ہونے کی کوشش نہ کروں ۔“

چنانچہ جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے، جو قلب کو خدا کی طرف سے پھیر دے سکتے تھے یا نفس میں غرورو تکبر پیدا کرسکتے تھے تو آپﷺ نہایت سختی کے ساتھ ان کا انکار فرماتے : حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گھر میں ایک پردہ لٹکالیا تھا جس میں تصویریں بنی تھیں آپﷺ کی نظر پڑی تو فرمایا:

اُمِیطِی عَنَّا قِرَامَکِ ھٰذا فانّہٗ لا تَزَالُ تَصاوِیرُہٗ تَعرِضُ فِی صَلَاتِی[2]

”ہمارے سامنے سے اپنا یہ پردہ ہٹا لو کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں سامنے آتی رہتی ہیں یعنی خلل انداز ہوتی رہتی ہیں ۔“

ایک صحابی نے بطور تحفہ کے آپﷺ کو حریر کا ایک چُغہ دیا، آپﷺ نے اسے پہن کر نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد نہایت ناگواری سے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا:

---

[1] بخاری مطبوعہ بولاق ص: ۹۹جز: ۸ کتاب التحجد باب قیام النبی ﷺ باللیل ۔

[2] بخاری جز: ۱ص: ۷۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی ثوب مصلب)

لاینبغی هٰذا لِلۡمُتَّقِیۡنَ❷
”یہ پرہیز گاروں کے قابل نہیں ۔“

غرور و کِبر کا سرچشمہ

غرور و کبر کا سرچشمہ مدح وستایش ہے۔ امراو سلاطین کو اسی مرض نے دنیا کی تمام چیزوں سے بالاتر بنادیا ہے۔ آنحضرت ﷺ اگرچہ خیر البشر تھے لیکن اگر کوئی شخص آپ ﷺکو انبیاء سابقین پر ترجیح دیتا تھا تو آپ ﷺ اسے منع فرماتے تھے۔ ایک صحابی اور ایک یہودی میں جھگڑا ہوگیا۔صحابی نے غصے میں قسم کھائی اور کہا:اس خدا کی قسم جس نے محمد ﷺ کو تمام دنیا سے افضل بنایا ہے۔ یہودی نے بھی قسم کھائی: “اس خداکی قسم جس نے موسیعلیسلم کو تمام دنیا پر ترجیح دی ہے۔” صحابی نے اس پرغصے میں آکر یہودی کے منہ پر طمانچہ مارا، اس نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی ، آپ نے حکم دیا کہ “مجھے موسیٰ پر ترجیح نہ دو”❸

احتساب قبیلہ و خاندان

خیرات گھر ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا تھا: وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۲۱۴ۙ﴿ (اپنے خاندان کے

---

❷ بخاری جز: ۱ص: ۸۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی فروج حریر)۔
❸ بخاری جز: ۸ ص: ۱۰۸(تاب الخصوصات : لاتخیرونی علی موسیٰ)

قریبی رشتے داروں کے آگے حق پیش کرو اور عذاب الٰہی سے ڈرا) (الشعرا :۲۱۴) جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنے پورے قبیلے اور خاندان کوجمع کرکے پیغمبرانہ لہجے میں یہ حکم الٰہی سنایا؛

"یا معشر قریش! یا معشربنی عبدمناف! یا معشربنی قصی! یا معشربنی عبدالمطلب! اے فاطمہ رضی اللہ عنہا محمد ﷺ کی بیٹی، تم سب اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ کیونکہ میں تمہیں قیامت کے دن کچھ بھی نفع و نقصان نہ پہنچا سکوں گا: اے فاطمہ رضی اللہ عنہا تجھے مجھ سے صرف جسمانی تعلق ہے اور میں رشتے کی بیل کو صرف دنیا ہی میں سر سبز و شاداب رکھ سکوں گا"[1]

یہ ایک عام احتساب تھا، لیکن مخصوص مواقع پر بھی آپ ﷺ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور اہل و عیال کونیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے رہتے تھے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ ایک رات اُٹھے اور فرمایا: "سبحان اللہ ! آسمان سے فتنے و فساد کی بارش ہورہی ہے اور برکات و فضائل کے خزانے کھل گئے ہیں ، حجروں میں سونے والیوں (ازواج مطہرات) کو جگا دو کیونکہ دنیا کی بہت سے کپڑے پہننے والی عورتیں آخرت میں برہنہ نظر آئیں گی"۔[2]

---

[1] ترمذی ص ۵۲۶ کتاب التفسیر

[2] بخاری جز: ۲ ص: ۳۰۔

صدقہ سے اجتناب میں اہتمام

آپ ﷺ نے تنزہ نفس اوراستغناکی وجہ سے فقر وفاقہ کے باوجود اپنے اوپر اور اپنے تمام خاندان کے اوپر صدقہ حرام کردیاتھا۔

امام حسین ضللہعنہ نے ایک مرتبہ بچپن میں صدقہ کی ایک کھجور اٹھاکر منہ میں ڈال لی آپ ﷺ کی نگاہ پڑی تو فوراً ٹوکا :"کخ کخ"، کیا تمہیں خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا؟"[3]

آپ ﷺ ایک مرتبہ شب کو حضرت علی ضللہعنہاور حضرت فاطمہ ضللہعنہاکے پاس آئے اور فرمایا: "تم لوگ اٹھ کر تہجد نہیں پڑھتے؟" حضرت علی ضللہعنہ نے جواب دیا: "یارسول اللہﷺ! ہماری نیند اور بیداری تو خدا کے اختیار میں ہے، اگر وہ جگائے گا تو جاگیں گے؟ آنحضرت ﷺ خاموش ہوگئے مگر اپنی ران پر افسوس کے ساتھ ہاتھ مارا اور یہ آیت پڑھی:

وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا [4] (الکہف ۵۴)

"آدمی بڑا ہی جھگڑا لو واقع ہوا ہے"

احتساب قوم

اگرچہ وہ تمام جزئی مواقع ، جہاں آنحضرت ﷺ نے احتساب کا فرض ادا کیا ہے، احتساب قومی کے تحت میں داخل ہیں ، لیکن آپ ﷺ نے دو

---

[3] بخاری جز: ۲ ص: ۱۲۸
[4] بخاری جز اول ص:۵۰

موقعوں پر نہایت بلیغ تشبیہ کے ساتھ اپنی اس خصوصیت کا اظہار قوم کے سامنے فرمایا : ایک موقع پر فرمایا:

”میری اور میری شریعت کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہے ، جس نے ایک قوم کے پاس آکر یہ وحشت انگیز خبر سنائی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر تمہاری طرف آتے ہوئے دیکھا ہے، میں ایک “نذیر عریاں ” ہوں ،❶ پس تمہیں ہوشیار ہوجانا چاہیے چنانچہ ایک گروہ نے اس کا کہنا مانااور وہ رات ہی رات بچ کر نکل گیا۔ دوسرے گروہ نے اسے جھٹلایا: نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر نے دھارا مارا اور اس گروہ کا استیعال کردیا”۔

دوسرے موقعہ پر فرمایا:

”میری اور تمام لوگو ں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ بھڑ کائی ، جب آگ کی روشنی چاروں طرف پھیلی تو پروانے اس پر ٹوٹ ٹوٹ کرگرنے لگے۔ اس نے پروانوں کو آگ میں جانے سے روکنا چاہا، لیکن وہ سب اس کے قابو میں نہ آسکے اور آگ میں گھس گئے۔

”اسی طرح میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر کھینچتا ہوں تاکہ آگ میں داخل ہونے نہ پاؤ، لیکن لوگ اس میں گھسے جاتے ہیں ۔”❷

---

❶ یعنی ننگا ڈرانے والا۔ عرب میں ہر اہم واقعہ کی خبر ننگے ہو کر دیتے تھے۔
❷ بخاری جز: ۸ ص ۱۰۱۔ ۱۰۲۔

عقائد کی درستی

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد تصحیح عقاید تھا۔ عقائد میں بدترین چیز شرک فی اللہ تھی ا ور آنحضرت ﷺ نے صرف شرک ہی مٹانے کے لیے جہاد کیا، جو احتساب کی آخری منزل ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عقائد ہیں ،جو عام دسترس سے باہر ہیں ۔اگر عام لوگوں کو ان میں غور و فکر کرنے کا موقع دیا جائے تو مذہبی عقائد میں بہت سے مفاسد پیدا ہوجائیں اور اسلامی عقائد کی سادگی فنا ہوجائے جو اسلام کا سب سے بڑا زیور ہے۔ اسی غرض سے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی یہ خصوصیت قراردی تھی کہ وہ غیر ضروری چیزوں میں وقت ضائع نہیں کرتے ، چنانچہ عہد نبوت میں جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے سختی کے ساتھ صحابہ کو زجرو توبیخ کی ہے۔

مسئلہ قضا و قدر

ایک مرتبہ صحابہ مسئلہ قضاوقدر کے متعلق مباحثہ کررہے تھے جس نے آگے چل کر مسلمانوں کے دو عظیم و حریف مقابل فرقے پیدا کردیے[1] آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو چہرہ مبارک غصے سے سُرخ ہوگیا اور فرمایا:

بہٰذا امرتم او لہٰذا خلقتم تضربون القراٰن بعضہٗ بعضا بھٰذا هلکت الامم قبلکم[2]

---

[1] یعنی جبری اور قدری
[2] سنن بن ماجہ ۱۶(باب القدر)

”کیا تم لوگوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے یا تم اس لیے پیدا کیے گئے ہو ؟ تم لوگ قرآن کو گڈمڈ کررہے ہو، گزشتہ قوموں کو اسی قسم کے لایعنی مسائل نے برباد کردیا۔“

چاند سورج کا گہن

اگرچہ اسلام نے عرب جاہلیت کے تمام توہم آمیز عقائد مٹادیے تھے،تاہم بعض باتیں رہ گئی تھیں اور کبھی کبھی ان کا ظہور ہوجاتا تھا۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے صاحب زادے ابراہیم رضی اللہ عنہ نے انتقال کیا تو اتفاق سے اسی دن سورج میں گہن بھی لگ گیا۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی موت کا اثر ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے فوراً اس خیال سے لوگوں کو روکا اور فرمایا :”چاند اور سورج میں کسی کے مرنے اور جینے سے گہن نہیں لگتا۔“

عبادات

عبادات چونکہ روز کی چیزیں تھیں جن میں سہوو غفلت اور بے عنوانی کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کو ان کے متعلق احتساب کی اکثر ضرورت پیش آتی تھی،[3] اسلام نے ادائے نماز کے لیے جماعت کو واجب کردیاتھا، لیکن اکثر لوگ اس میں غفلت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ

---

[3] بخاری جز: ۲ص ۳۴۔

آنحضرت ﷺ نے جماعت میں چند اشخاص کو ڈھونڈا تو نہ پایا، نہایت برہم ہوئے اور فرمایا:

"جی میں آتا ہے کہ ایک شخص کو امام بنا کر خودان لوگوں کے پاس چلا جاؤں اور لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر ان کے گھر آگ میں پھونک دوں "۔[4]

نماز میں تخفیف کی تاکید

بعض لوگ جب امامت کرتے تھے تو نماز میں طول دیتے تھے، جس سے کاروباری اور ضعیف لوگ گھبراجاتے تھے۔ ایک شخص نے اسی بنا پر امام کی شکایت کی، آپ ﷺ کو معمول سے زیادہ غصہ آگیا اور فرمایا:

"تم مذہب سے لوگوں کو متنفر کررہے ہو، امام کو نمازمیں تخفیف کرنی چاہیے کیونکہ ان میں مریض، ضعیف، کاروباری ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں ۔[1]

خشوع فی الصلوٰۃ

نماز کا اصل مقصد خشوع وخضوع ہے۔ لیکن جب کسی کے طرزِ عمل سے ان کا ظہور نہیں ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ اسے تنبیہ فرماتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے نہایت عجلت کے ساتھ نماز پڑھی، نماز پڑھ چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا:" نماز کودہراؤ، تم نے نماز پڑھی ہی نہیں ہے" ا س نے تین بار نماز دہرائی اور آپ ﷺ نے تینوں بار ٹوکا،

---

[4] صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد: ۱ ص: ۲۴۳
[1] بخاری جز: ۱ ص: ۲۶

آخر میں اس نے کہا "اب میں اس سے بہتر نماز نہیں پڑھ سکتا" آپ ﷺ نے تکبیر، قرات ، رکوع ،سجود، قیام اور تعوذ کے وہ طریقے بتائے جن سے اطمینا ن، سکون وقار اور اعتدال کا اظہار ہوتا تھا۔❷

جزئیات پر نظر

عبادات اور مقدمات ،عبادات کے متعلق آپ ﷺ نہایت معمولی اور جزئی باتوں پر بھی گرفت فرماتے تھے۔ ایک بار سفر میں تھے، نماز عصر کا وقت آگیا، صحابہ نے پاؤں کا مسح کیا۔ آپﷺ نے دیکھا تو دور سے بہ زور آواز دی۔

ویل للا عقاب من النار❸

"ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔"

ابتدائے اسلام میں نماز کے قیام و ادا کی حالت بالکل ابتدائی تھی اورتمام جزئیات و فروع ابھی واضح نہیں ہوئے تھے، اس طرح کا بتدریج ارتقاءمذہب کی ہر تعلیم میں ہوتا ہے۔ موجودہ حالت ایک مدت کے تغیرات کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابتدا میں اکثر لوگ مسجد کے اندر تھوک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے مسجد میں تھوک کا دھبا دیکھا، خود اٹھے اور ہاتھ مبارک سے اسے مٹادیا۔ پھر فرمایا "نماز میں ہر شخص خدا سے سرگوشی کرتا ہے" اس لیے کسی شخص

---

❷ بخاری جز: ۱۴۸
❸ بخاری جز: ۱ص : ۲۷

کو قبلہ کی طرف تھوکنا نہیں چاہیے، البتہ دائیں بائیں یااپنے پاؤں کے نیچے تھوک سکتا ہے۔[1]

یہاں یہ واضع رہے کہ اس وقت مسجد کا فرش پختہ نہ تھا،صحن مسجداور عام سطح زمین میں سوائے حدود عمارت کے اور کوئی امتیازقائم نہ تھا۔ ریتلی زمین تھی اور وہ ہر طرح کی رطوبت جذب کر لیتی تھی لیکن اب مسجدوں کا داخلی حصہ (ہی نہیں صحن کا فرش بھی) پختہ ہوتا ہے، پس وہاں تھوکنا مسجد کی صفائی اور نمازیوں کے حقوق نشست پر حملہ کرنا ہے۔

بدعت

نظام مذہبی کا سب سے زیادہ خطرناک مرض بدعت ہے، اگرچہ آنحضرت ﷺکے زمانے میں مسلمان اس مرض میں مبتلا نہیں ہوسکتے تھے تاہم جاہلیت کے زمانے کی بہت سی بدعتوں کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی تھی، اس لیے آپ ہمیشہ ان کے مٹانے میں مصروف رہتے تھے۔

پیدل چلنے کا حلف

بدعت کی مختلف قسمیں اور مختلف مظاہر ہیں لیکن اس کی بدترین شکل رہبانیت اور جوگ ہے،جو یہودو نصاریٰ کے مذہب کا جزو بن گئی تھی۔ وَرَھبَانیۃ ابتدعو ھا(اور رہبانیت انہوں نے خود نکالی۔ ا لحدید:۲۸) چونکہ عرب پر یہود و

---

[1] بخاری جز: ۱ص:۸۶۔

نصاریٰ کا مذہبی اثر غالب تھا اس لئے وہاں بھی اس قسم کی بدعات پیدا ہوگئی تھیں ۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے جارہا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا:” اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ ضعف کی وجہ سے بیٹوں کے سہارے چلتا ہے۔“آپﷺ نے فرمایا:” اس نے اپنے آپ کو کیوں عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟ خدا اس سے بے نیاز ہے۔“

ننگے پاؤں چلنے کی منت

عقبہ بن عامر کی بہن نے خانہ کعبہ تک ننگے پاؤں پیدل چلنے کی منت مانی اور عقبہ کو آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا کہ پوچھ آئیں ۔ آنحضرت ﷺ نے فر مایا: “سواری پر بھی جاسکتی ہے”۔[1]

کھڑے رہنا اور بات نہ کرنا

ایک مرتبہ آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اورلوگ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر سن رہے تھے لیکن ایک شخص کھڑا تھا ۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا ، اس نے نذر مانی ہے کہ ہمیشہ کھڑا رہے گا ، سایہ میں نہ بیٹھے گا، کسی سے بات چیت نہ کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اسے بیٹھنا

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۷۰۱۔

چاہیے،سایہ میں آنا چاہیے، گفتگو کرنی چاہیے اور روزہ کو بھی پورا کرنا چاہیے۔❷

ناک میں نکیل

اسی طرح آپ ﷺ کو ایک شخص نظر آیا جسے ایک آدمی ناک میں نکیل ڈال کر خانہ کعبہ کا طواف کرارہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی ناک کی رسی کاٹ دی اور فرمایا: “اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔” ❸

تشدد آمیز مذہبی انہماک

لیکن ان بدعات سے زیادہ ان اصولوں کا مٹانا ضروری تھا جن کی بنا پر بدعات پیدا ہوتی ہیں ، بد عات کا سب سے بڑا سر چشمہ ،تشدد آمیز مذہبی انہماک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے نظام عبادات کو نہایت سہل و آسان طریقہ پرقائم کیا ہے،اس لحاظ سے اگرچہ خود اسلام کے سنگ بنیاد پر بدعت کی عمارت قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاہم ابتدا میں صحابہ کا ایک پرجوش و مخلص گر وہ نہایت شدت کے ساتھ عبادت میں مصروف رہنا چاہتا تھا ۔ جب آنحضرت ﷺ نے ایک دن چھوڑ کے روزہ رکھنا شروع کیا تو اکثر صحابہ رضی اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس کی تقلید کی،لیکن آپ ﷺ کو نظر آیا کہ یہی چیز بدعت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ

---

❷ بخاری جز ۸ ص ۱۴۳۔

❸ بخاری جز: ۸ص ۱۴۳۔

رضی اللہ علیہم اجمعین کو سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اس پر بھی لوگ باز نہ آئے تو معمول کے خلا ف متصل روزے رکھنا شروع کر دیا کہ لوگ خود گھبرا کر باز آجائیں ۔[4] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کثرت صوم و صلوٰۃ سے اسی بنا پر روک دیا تھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو بھی شدت زہد سے منع فرمایا تھا اور آپ ﷺ نے ان کی تائیدکی تھی۔[5]

رسم و رواج کا انسداد

رسم و رواج کو جب استحکام ہوجاتا ہے تو بدعات کی طرح ان کاچھوڑنا بھی نہایت شاق گزرتا ہے۔ حالانکہ اکثر حالتوں میں وہ بدعات سے کم ضرر رساں ثابت نہیں ہوتیں اور بڑی قیامت یہ ہے کہ بعض اوقات مذہبی حیثیت پیدا کر لیتی ہیں ۔

عرب میں بہت سی مضر ر سمیں جاری ہوگئی تھیں ، جن کی پابندی نہا یت ضروری خیال کی جاتی تھی،اس لیے بدعات کے ساتھ ساتھ ان کا بھی انسداد کیا گیا۔

میت کا ماتم

عرب کے جذبات نہایت رقیق و لطیف تھے، اس لیئے وہ اعزہ و اقارب کی موت سے نہایت متاثر ہوتے تھے۔ جس کا اظہار مختلف حیثیتوں

---

[4] بخاری جز: ۸ ص ۱۷۴۔

[5] بخاری جز۸ ص ۳۲

سے کیا جاتا تھا۔ عورتیں نہایت شدت کے ساتھ میت پر گر یہ و بکا کرتی تھیں ، منہ نوچنا،سر کے بال منڈوالینا ،گریبان چاک کر دینا،شوہر کی موت پر برسوں تک خاص پابندیوں کے ساتھ گھر سے باہر رہ کر ماتم کرنا عرب کی عورتوں کا عام شعار تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان تمام رسوم کو نہایت سختی سے مٹایا۔ شخصی حالتوں کے علاوہ میت پر قومی حیثیت سے بھی ماتم کیا جاتا تھا،یعنی قبیلہ کی بہت سی عورتیں جمع ہوکر میت کے محاسن و فضائل بیان کرتیں اور باہم روتی تھیں ۔ اسی رسم کا نام"نیاحہ" ہے۔ آنحضرت ﷺکے زمانہ تک یہ رسم قائم تھی، لیکن آپ ﷺ کے سامنے جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے تو اس طرح کی عورتوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی۔

حضرت ابو سلمہ ضللہعنہ کی شہادت

حضرت ام سلمہ ضللہعنہاکو جب اپنے شوہر کے انتقال کی خبرملی تو بولیں حسرت "مسافر مسافرت میں مرا۔اس پر اس قدر گریہ و بکا کروں گی کہ یادگار رہے گا" چنانچہ اس غرض سے اٹھیں تو عرب کے دستور قدیم کے مطابق ایک عورت نے گریہ و بکا میں اس کا ساتھ دیناچاہا۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: کیا اس گھر میں شیطان کو داخل کرنا چاہتی ہو ، جس سے خدا نے اسے نکال دیا ہے؟"۔[۵]

---

[۵] صحیح مسلم جلد اول ص ۳۴۰

حضرت جعفر ضاللہعنہ کی شہادت

جب حضرت جعفرضاللہعنہ بن ابی طالب کی شہادت کی خبر آئی تو ان کی عورتوں نے اسی طریقے سے نوحہ کرنا شروع کیا۔ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کو خبر کی ۔ آپ ﷺ نے منع کرنے کا حکم دیا،لیکن و ہ ناکام واپس آیا۔ آپﷺ نے اسی غرض سے دوسری مرتبہ پھرا سے بھیجا، اس پر بھی کچھ اثر نہ ہوا تو تیسری بار فرمایا: "جاکر ان عوتوں کے منہ میں خاک جھونک دو۔"[2]

جنازے کے مراسم

جنازے کے متعلق بھی اسی قسم کی متعدد رسمیں پیدا ہوگئی تھیں مثلاً اہل عرب جنازے کے ساتھ سواری پر جاتے تھے۔آنحضرتﷺنے چند اشخاص کو دیکھا کہ وہ ایک جنازے کے ساتھ سوار ہو کر جارہے ہیں فرمایا:"کیا تم کو شرم نہیں آتی کہ فرشتے پیدل ہیں اور تم سواری پر جارہے ہو۱۔"[3]

جنازے کی مشایعت صرف کر تے پہن کر کرتے تھے۔ اظہار غم کے لئے چادر ا تار ڈالتے تھے۔ چادر عرب کا عام لباس تھا آنحضرت ﷺ نے اسی وضع میں چند اشخاص کو دیکھا تو فرمایا: "کیا جاہلیت کے طریقے پر عمل کر رہے ہو "۔[4]

---

[2] صحیح مسلم جلد اول ص ۳۴۵

[3] سنن ابن ماجہ ص:۲۵۰

[4] سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۱

عورتوں کی شرکت جنازہ

جنازہ میں عورتیں بھی عموماً شریک ہوتی تھیں ، چنانچہ آپ ﷺ نے چند عورتوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھا: "کیوں بیٹھی ہو:" بولیں : "ایک جنازہ کا انتظار ہے۔" فرمایا: " کیا اس کو غسل دوگی؟" ان سبھوں نے کہا: "نہیں " پھر فرمایا: "تو کیا لاش کو کندھا دوگی؟" ان سبھوں نے کہا:"نہیں ۔" پھر فرمایا: "کیالاش کو قبر میں اُتاروگی؟" بولیں : "نہیں "، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر واپس جاؤ۔"[۵]

فخر و غرور کی ممانعت

عرب کی فخر پسند طبیعت ہمیشہ باپ دا دا کے کارناموں کا ذکر نہا یت بلند آہنگی سے علیٰ روس الاشہاد کرتی تھی، یہاں تک کہ زمانہ حج میں بھی یہ داستان پارینہ تازہ کی جاتی تھی۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (تو چاہیے کہ جس طرح پہلے اپنے آبا و اجداد کی بڑائیوں کا ذکر کر تے تھے، اب اسی طرح اللہ کا ذکر کیا کرو بلکہ اس سے بھی زیادہ ۔ البقرہ : ۱۹۹) ۔ اس کو "مناشرت" کہتے تھے۔ فخر و غرور کے اظہار کایہ طریقہ اکثر بڑی بڑی نزا عین قائم کردیتا تھا۔اسلام نے اس رسم کو بالکل ہی مٹا دیا،لیکن اس کا اثر مختلف صورتوں میں پھیل گیا تھامنجملہ ان کے ایک صورت یہ تھی کہ باپ دادا کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ

---

[۵] سنن ابن ماجہ ص: ۳۹۷

حضرت عمر ضللہعنہ نے بھی قسم کھائی آپﷺنے فرمایا: "خدا باپ دادا کے نام کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے ،صرف خدا کی قسم کھانی چاہیے،ورنہ خاموشی بہتر ہے"۔[۵]

اخلاقی اصلاح

آنحضرت ﷺکی بعثت کا اصلی مقصد اصلاح اخلاق و تزکیہ نفس تھا، جسے خود آپ ﷺ نے ظاہر فرمادیا تھا:

انّما بعثت لاتمّم مکارم الاخلاق۔

"میں اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہُوا ہوں ؑ"

اور یہ مقصد ہمیشہ آپ ﷺ کے پیش نظر رہتا تھا۔ اصولی طور پر آپ ﷺ نے اخلاق کے متعلق جو اصلاحیں کیں ، وہ ان کے علاوہ ہیں ، جزئی طور پر جب کسی شخص سے کسی قسم کی بداخلاقی کا ظہورہوتا تھا تو آپ ﷺ فوراً اسے تنبیہ فرمادیتے تھے۔ چنانچہ احادیث میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں ، جن کے جزئیات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

انسداد گداگری

اسلام نے زکوٰۃ کا ایک مستقل نظام قایم کردیا تھا کیونکہ خاص خاص لوگ اس کے حقیقی مستحق تھے عام طور پر اسلام گداگری اور مفت خوری کو نہایت ذلیل پیشہ قرار دیتا ہے۔ یہی

---

[۵] سنن ابن ماجہ ص:۳۹۷

وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ غیر مستحق لوگوں کو گداگری سے نہایت سختی کے ساتھ روکتے تھے۔

ایک انصاری کی مثال

ایک مرتبہ ایک انصاری نے آپ ﷺ سے سوال کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "تمہارے گھر میں کچھ پونجی بھی ہے؟" اس نے کہا: ایک ٹاٹ ہے جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں" آپ ﷺ نے فرمایا: "جاکر اسے لے آؤ" وہ جاکر اٹھا لایا، آپ ﷺ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے بغرض فروخت پیش کیا۔ ایک صحابی نے ایک درہم پر لینا چاہا، دوسرے صحابی نے قیمت میں اضافہ کرکے دو درہم پر لے لیا۔ آپ ﷺ نے دونوں درہم اس انصاری کے حوالے کیئے اور فرمایا: ایک درہم کا غلہ لیکر گھر میں دے آؤ، دوسرے درہم کا ایک بسولا خرید کر میرے پاس لاؤ" وہ بسولا خرید لایا ۔ آپ ﷺ نے خوددست مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور حکم دیا "جنگل میں جاکر لکڑی کاٹو اور بیچو۔ پندرہ دن تک میں تمہاری صورت نہ دیکھوں ۔" وہ لکڑی کاٹ لایا اور اسے فروخت کیا۔ دس درہم ہاتھ آئے یہ رقم لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اس رقم سے کُچھ غلہ اور کچھ کپڑا خرید کر کھاؤ پہنو، گداگری سے یہ بہتر ہے۔ وہ تو آدمی کے چہرے کا داغ ہے، صرف اپاہج لوگوں کے لیے جائز ہوسکتی ہے"۔[1]

---

[1] سنن ابن ماجہ ص:۳۹۷

رشوت خوری

عدل و انصاف کی بربادی اور ظلم کی روح خبیث کا سب سے بڑا سبب رشوت خوری ہے۔ عہد نبوت میں چونکہ آنحضرت ﷺ کے فیض محبت سے صحابہ کا معیار اخلاق نہایت بلند ہوگیا تھا اس لیئے رشوت خوری کی مثالیں نہیں ملتیں ۔ تا ہم جب کبھی کسی کے طرز عمل پر رشوت کا شبہ بھی ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔ حکام و عمال کو اکثر رشوتیں نذرو ہدیے کے ذریعے سے دی جاتی ہیں ۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی ا سی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ آپ ﷺ نے قبیلۂ ازدکے ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے واپس آکر آنحضرتﷺ کے سامنے صدقے کا مال پیش کیا اور کہا:"اتنا مسلمانوں کا مال ہے اور اس قدر مجھے ہدیہ ملا ہے۔" چونکہ اس قسم کا ہدیہ رشوت کا ذریعہ بن سکتا تھا اور اگر علانیہ اس کا انسداد نہ کیا جاتا تو اور لوگ بھی اس طریقہ سے فائدہ اٹھاتے، اس لیے آپﷺ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا: اس عامل کو دیکھو جو کہتا ہے کہ یہ مال مسلمانوں کا اور یہ مال میرا ہے۔ ذرا وہ اپنے گھر میں تو بیٹھ کے دیکھے کہ اس کے پاس ہدیہ آتا ہے یا نہیں ؟❷

خیانت کا انسداد

معاملات میں خیانت، چالاکی اور خدع و فریب

---

❷ صحیح مسلم جلد: ٢ ص: ١١٣

کا سب سے زیادہ موقع تجارتی کاروبار میں مل سکتا ہے ، اس لیے آنحضرت ﷺ خاص طور پر اس کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بازار میں سے گزرے اور ایک شخص کے غلے کے ڈھیرکے اندر ہاتھ ڈال کے دیکھا تو نمی محسوس ہوئی چونکہ بھیگنے سے غلے کا وزن بڑھ جاتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا:" جو شخص دھوکا دیتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے"❶

چونکہ عرب میں غلہ بہت کم آتا تھا اس لیے جب باہر سے سوداگر غلہ لاتے تھے تو لوگ شہر سے باہر ہی تخمیناً خرید لیتے تھے، لیکن اس سے کئی طرح کے نقصانات پیدا ہوتے تھے۔ اول تمام شہر محروم رہ جاتا تھا، دوسرے یہ ایک غیر معین و غیر معلوم بیع تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے روکا۔ آپ ﷺ لوگوں کو عموماً اس پر سزا دیتے تھے۔❷

حفظ الید و حفظ اللسان

اسلام نے ایک عظیم الشان اخلاقی اصول یہ قائم کیا تھا۔

المسلم من سلم المسلمون من یدہ و من لسانہ۔

" مسلمان وہ ہے ، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو ایذا نہ پہنچے۔"

اگرچہ اس اصول کی خلاف ورزی کا اثر ہر موقع پر بُرے نتائج پیدا کرتا ہے، تاہم برابر کے

---

❶ سنن ابن ماجہ ص : ۴۰۳
❷ بخاری جز: ۳ ص: ۶۸

درجہ کے لوگ انتقام لیکر اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں ،کمزور انسانوں کو تو اس کا بھی موقع نہیں مل سکتا چنانچہ اس قسم کے موقعوں پر جب کوئی شخص اس اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا تھا تو آپ ﷺ فوراً ٹوک دیتے تھے ۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے غلام کو ماں کی گالی دی ، آپ ﷺ نے فرمایا: "تم اس کو گالی دیتے ہو؟ تم میں زمانہ جاہلیت کا اثر باقی ہے ، تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں ، جنہیں خدا نے تمہارے سپرد کردیا ہے، جو تم کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ، جو تم پہنو، وہی ان کو پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لو، اگر لیتے ہو تو ان کی اعانت کرو۔[3]

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ انصاری کہتے ہیں :"میں اپنے غلام کو مار رہا تھا یکایک پیچھے سے ایک آواز آئی، اے ابو مسعود رضی اللہ عنہ! ہوشیار! خدا کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے " ۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے۔ حضرت مسعود رضی اللہ عنہ پر اس کا یہ اثر پڑا کہ انہوں نے غلام کو آزاد کردیا۔[4]

مداحی اور عیش پروری کا انسداد

انسان خوشامد پسند ہے اور مداحی اس دبی ہوئی چنگاری کو اور بھی ابھار دیتی ہے امراوسلاطین کو اسی نے تباہ کردیا۔ آنحضرت

---

[3] بخاری جز: ۱ ص۱۱

[4] ابوداؤد ص: ۳۴۸ جلد: ۲(باب فی حق الملوک)

کو خودمدح سے نفرت تھی اور لوگوں کو بھی اس سے منع فرماتے تھے، چنانچہ ایک آدمی نہایت مبالغہ آمیز طور پر ایک شخص کی مدح کر رہا تھا، آپ نے دیکھا تو فرمایا "تم نے اسے ہلاک کردیا "❷

عیش پرستی بظاہر تمدن کا زیور ہے، لیکن درحقیقت اس کے اندرونی نظام کا اصلی گھن یہی چیز ہے۔ آنحضرت کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ آپ تمام لوگوں کو اسی سادگی کی تعلیم دیتے تھے اور جب کبھی کوئی چیز اس کے خلاف نظرسے گزرتی تو اس سے بیزاری ظاہر فرماتے تھے۔

ضرورت سے زائد عمارت

ایک مرتبہ آپ راستہ سے گذرے تو ایک بلند عمارت نظر آئی۔ آپ نے فرمایا کس کا مکان ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام لیا۔آپ خاموش ہوگئے، لیکن دل میں بات رکھ لی۔ وہ انصاری آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔آپ نے منہ پھیرلیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے آنحضرت کی ناراضگی کا سبب پُوچھا تو لوگوں نے واقعہ بیان کیا۔ وہ فوراً گئے اور اس مکان کو منہدم کردیا۔آپ دوسری بار اس طرف سے گزرے تو فرمایا کہ وہ عمارت کیا ہوگئی: لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صاحب خانہ نے آپ کی ناراضگی کے خوف سے اس کو

---

❷ بخاری جز: ۳ص:۱۷۷

گرادیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ گھر جو ضرورت سے زائد ہو، صاحب خانہ پر وبال ہے۔[1]

آرائشی پردے

ایک مرتبہ آپ ﷺ کسی لڑائی سے واپس آئے، حضرت عائشہ ضاللہعنہا نے شوق و محبت کے ساتھ گھر کو ایک نہایت رنگین پردے سے سجایا۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہ ضاللہعنہا نے سلام کیا، لیکن آپ ﷺ کے چہرے سے ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے اور سلام کا جو اب تک نہ دیا۔ پھر خوددست مبارک سے پردے کے دو ٹکڑے کردیے اور فرمایا کہ خدا نے ہمیں مٹی اور پتھر کو آراستہ کرنے کا حکم نہیں دیا۔[2] حضرت فاطمہ ضاللہعنہا کے ساتھ بھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں ۔

عفت و عصمت

اسلام پاکبازی اور عفت کی تعلیم دینے کے لیئے آیا تھا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ۙ (المؤمنون۔ ۵)

”کامیاب مسلمان وہ ہیں جو عفیف اور پاکباز ہیں ۔“

اس بنا پر جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے جن سے مسلمانوں کی اس خصوصیت پر حرف آسکتا تھا، توآنحضرت ﷺ فوراً اس سے تعرض فرماتے تھے۔

---

[1] ابوداؤد جلد: ۲ص ۳۵۶(کتاب الادب، باب ماجبأ فی النہا)

[2] ابوداؤد ص: ۲۱۶ جلد:۲

حضــرت فضل ضــللعن بن عبــاس ضــللعن نایت وجی آدمی تھ زمان حج میں آنحضـرت ن انیں اپن ساتھ سوار کرلیـا تھـا ایـک خـوش روعورت آنحضرت کی طرف فتویٰ پُوچھــن ک لــی بــڑھی فضل ضــللعن ن اس کــوپر شــوق نگــاوں سـ دیکھنـا شـروع کیـا آنحضـرت ن خوددست مبارک سـ ان کی ٹھـوڑی پکـڑ کـر من اس کی طرف س پھیر دیا❷

ستر عورت کی تاکید

یورپ کـو آج تذیب و تمـدن پـر بـڑا نـاز اگرچ یورپ کی اخلاقی حـالت ک اصـلی منـاظر نایت نفـرت انگـیز یں بظـار ر انگریــز کـو ستر عورت کا خیـال رتـا اور کسـی ن کسـی انگریز کو را میں برن تن بت کم دیکھا وگـا لیکن اســلام کی تذیب اس بـــار میں صـــرف نمائشـــی لبـــاس آرائی ی کـــو کـــافی نیں سمجھتی ایک بار آنحضـرت ن ایـک شـخص کـو میدان میں برن نات وئ دیکھا، فوراً منـبر پـر تشریف لائ اور ایک عام خطب دیا:

”خدا صاحبِ حیا کو پسند کرتا پس تم میں س جو کوئی غسل کر، چاین ک پــرد ڈال لیـا کر“ آنحضـرت کـو سـتر عـورت کـا اس قـدر خیال تھا ک ایک مرتب مِســوَر بن مَخــرمَ ن ایـک بھاری پتھر اٹھایا اس حالت میں ان کا کــپڑا گــر گیا آپ ن فوراً ٹوکـا ک کـپڑا اٹھاؤ بـرن ن

---

❷ بخاری جز: ۸ ص: ۵۱

ہوں [8] لیکن یورپ کی ستر پوشی کا یہ حال ہے کہ غسل خانوں ، حماموں ، بحری ساحلوں اور تیراکی کے حوضوں میں صدہامتمدن انسان برہنہ ہوکر ایک دُوسرے کے سامنے نہاتے ہیں !

اصلاح شؤن النساء

اس معاملہ میں عورتوں کی حالت مختلف حیثیتوں سے قابل توجہ اور محتاج اصلاح تھی۔ عرب میں مخنثوں کا ایک گروہ موجود تھا، جو علانیہ گھروں میں آتا جاتا تھا۔ ایک بار ایک مخنث نے ازواج مطہرات ضیاللہعنہن کے سامنے ایک عورت کے محاسن بلکل ایک مرد کی نظر و ذوق سے بیان کیے۔ آنحضرت ﷺ نے فوراً حکم دیا کہ یہ لوگ گھر میں نہ گھسنے پائیں ۔[9]

عر ب کی عورتوں میں جو بد اخلاقیاں پھیل گئی تھیں ان میں ایک بداخلاقی یہ بھی تھی کہ بعض عورتیں مردوں کی وضع اختیار کرتی تھیں ۔ آنحضرت ﷺ نے ان پر عموماًلعنت بھیجی ہے۔ جب کبھی کسی عورت کی وضع کو مردوں سے بلاقصد بھی مشابہت ہوجاتی تو آپ ﷺ فوراً ٹوک دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ ضاللہعنہا دوپٹہ اوڑھ رہی تھیں ۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا:

لبة لالبتین ”ایک تہہ کرکے اوڑھو، دو تہے نہ کرو۔“

کیونکہ دو تہہ کرنے سے عمامہ کے ساتھ مشابہت پیدا ہوجاتی، جو مردوں کی خاص وضع

---

[8] ابوداؤد جلد: ۲ ص:۲۰۱

[9] مسلم جلد: ۲ ص: ۲۴۴

ہے۔ آپ ﷺ کو اس پر اس قدر اصرار تھا کہ ایک عورت نے پردے سے آپ ﷺ کو ایک خط دینا چاہا اس کے ہاتھوں میں مہندی نہ تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا؟" اس نے کہا "میں عورت ہوں ۔" فرمایا: "اگر تم عورت ہو تو مہندی لگاؤ۔"

غیر محتاط لباس کی ممانعت

اکثر عورتیں نہایت غیر محتاط لباس پہنتی تھیں ۔ اس کے متعلق قرآن حکیم میں آیتیں نازل ہوئی ہیں ۔ خود آنحضرت ﷺجب کبھی اس قسم کی بے احتیاطی ملاحظہ فرماتے تھے توفوراً روک دیتے تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بن ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس ایک کپڑا پہن کے آئیں تو آپ ﷺ نے منہ پھیرلیا پھر فرمایا۔"عورت بلوغ کے بعد صرف منہ اور ہاتھ کھلا رکھ سکتی ہے۔ "❷

عورتیں عموماً راستوں میں مردوں کے دوش بدوش چلتی تھیں ۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ مسجد سے نکلے تو دیکھا کہ مرد عورت دونوں ساتھ ساتھ راہ میں چل رہے ہیں ۔ آپ ﷺ نے فرمایا"تم کو درمیان راہ چلنے کا کوئی حق حاصل نہیں ، راستے کے کنارے چلنا چاہیے"۔ اس کے بعد سے عورتیں دیواروں سے لگ کر چلنے لگیں ۔

اس قسم کے بیسیوں واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں ۔

اصلاح ذات البین

---

❷ ابوداؤد جلد۲ص:۲۱۱

اسلام نے مسلمانوں پر سب سے بڑا احسان الٰہی یہ جتایا ہے:

فَاَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران:۱۰۳)

” خدانے تم کو باہم دشمنی کے بعد بھائی بھائی بنادیا۔“

لیکن باہمی اختلاف و تنازع سے یہ رشتہ اخوت ٹوٹ سکتا تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ کے فرائض احتساب میں سب سے اہم فرض رفع نزاع تھا، چنانچہ جب کبھی آپ ﷺ کو کسی شروفسادخانگی کی خبر ملتی تو آپ ﷺ جاتے اور اصلاح فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی عمر وبن عوف میں باہم کچھ ناچاقی پیدا ہوگئی ہے۔ آپ ﷺ چند صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور معاملے کے سلجھانے میں اس قدر دیر لگی کہ نماز کا وقت آگیا ، چنانچہ حضرت بلال کی درخواست کرنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔[1]

عبداللہ بن ابّی بن سلول ایک بار نہایت گستاخانہ پیش آیا، یہاں تک کہ صحابہ سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ لڑنے بھڑنے پر تیار ہوگئے، اس پر عبداللہ بن ابّی کے حامی بھی اُٹھے اور فریقین باہم دست وگریبان ہوگئے، لیکن آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو سمجھا بُجھا کر الگ کیا اور فرمایا کہ “صلح فساد سے بہتر ہے۔“[2]

---

[1] ابوداؤد جلد۲ ص: ۲۱۸

[2] ابوداؤد جلد۲ص:۲۱۱

واقعہ افک کے متعلق خود مسلمانوں کے دو قبیلوں اوس وخزرج میں سخت نزاع قائم ہوگئی اور دونوں فریق آمادہ جنگ ہوگئے لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔

مراعات ادب

آنحضرت ﷺ کو بڑوں کے ادب وتعظیم کا نہایت خیال رہتا تھا۔ معمولی باتوں پر بھی گرفت کرتے تھے۔ ایک موقع پرجب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود کے چھوٹے بیٹے نے گفتگو میں سابقت کرنی چاہی تو آپ ﷺ نے فوراً ٹوک دیا:

الکبر الکبر ”یعنی پہلے بڑے کو بولنے دو۔“③

اخلاقی احکام

سچ یہ ہے کہ اخلاقی احکام کا تعلق جہاں تک تعلیم محض سے ہے، وہ کوئی ایسی متاع غریب نہیں جس کے پیش کرنے پر اسلام فخر کرے۔ اخلاقی احکام ہمیں ہر جگہ مل سکتے ہیں اور قریباً ہر مذہب نے اپنا مقصد یہی بتلایا ہے کہ انسان کو اخلاق کا وعظ سنائے ۔ اگر قرآن حکیم تعلیم دیتا ہے کہ عہد ومواثیق کی پابندی کر و تو قوانین موسوی اور ضابطہ ناصری بھی یہ نہیں کہتا کہ عہد باندھ کر توڑ ڈالو۔ حتٰی کہ آریائی نسل کی وہ فلسفیانہ روحانیت بھی جس نے ہندوستان اور ایران میں ظہور کیا، اپنی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ شاخ کے اندر اخلاقی تعلیمات و

---

③ ابوداؤد جلد۲ ص ۳۶۰

احکام سے لبریز ہے۔

پس اصلی چیز تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے نتائج اور اس کا عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا، اس نے عملی شکل میں کیسی صورت اختیار کی؟ انسان کی رُوح اس لیے بیمار نہیں کہ زبانوں نے تعلیم کم کردی اور کاغذوں پر زیادہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا اصل دُکھ زندگی کی عملی مشکلات میں ہے اور صرف وہی تعلیم فتحمند ہوسکتی ہے، جو ایک مستحکم عملی نمونہ اپنے ساتھ رکھتی ہو۔

عملی حقیقت کے لحاظ سے اوّلین نمونہ حامل قرآن و اوّلین داعی اسلام (علیہ السلام) کا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۔ ۲۱)

یہاں ہم صرف اسی حیثیت سے اسلامی مواثیق و عہد پر نظر ڈالیں گے۔

جنگ و صلح کی متضاد حالتیں

جنگ و صلح کی متضاد حالتوں میں انسان کا نظام اخلاق دفعتہ بدل جاتا ہے۔ ایک شخص بہ ذاتِ خود نہایت رحم دل ہے لیکن میدان جنگ میں جاکر نہایت بے رحم ہو جاتا ہے ۔ایک شخص ذاتی معاملات میں نہایت حلیم الطبع ہے، لیکن کسی فوج میں شامل ہوکر سخت مشتعل اور مغلوب الغضب ہوجاتا ہے۔ ایک شخص امن و صلح کے زمانے میں نہایت صادق العقول اور پابند عہد ہے،

لیکن زمانہ جنگ میں اتنا ہی خراع اَور عہدشکن بن جاتا ہے۔ ایک جماعت ، ایک قوم، ایک ملک، امن و سکون کے دور میں انسانیت کا بہتر سے بہتر نمونہ ہوتا ہے لیکن جنگی اغراض، طامعانہ اقدامات اور حربی مصالح کے عہد فساد میں آکر چارپایوں سے زیادہ وحشی اور درندوں سے زیادہ خونخوار ہوجاتا ہے ۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴؁ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵؀[1] اسی بنا پربعض حکماءکا قول ہے کہ "سیاست اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی"۔

لیکن دنیا میں صرف "اسلام" ہی ایک ایسی زندہ ہستی ہے جو اپنے پہلو میں دل اور دل میں ایک غیرممکن التغیرا خلاقی طاقت رکھتی ہے۔ اس پر عوارض خارجیہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا ، ظاہر و باطن ، شخصیت و جمہوریت ، افتراق واجتماع ،جنگ و صلح ، اس کے لیے تمام حالتیں یکساں ہیں ۔ اس کا معیار اخلاق جس طرح امن و صلح کی حالت میں قائم رہا، اسی استحکام واستواری کے ساتھ جنگ کے سیلاب اور آتش و خون کے طوفان میں بھی قائم و ثابت نظر آیا۔

رسُول اللہ ﷺ کی حیات طیّبہ

پیغمبر اسلام (علیہلسلتلسلم) کی زندگی اعمال انسانیت کی ہر شاخ پر حاوی تھی۔ اس میں حق و صداقت کے آغاز کی غربت و مظلومی

---

[1] بلا شبہ ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا، پھر اسے بد سے بد تر حالت میں پھینک دیا۔(التین:۴۔۵)

بھی تھی اور تمام کی فتح مندی و کامرانی کا جاہ وجلال اور سطوت و جبروت بھی تھا۔ انہوں نے امن و صلح کے ایّام بھی کاٹے اور امن و صلح کے لیے جنگ کی تلوار باندھنے کا حکم بھی دیا۔ اس لیے عہد و میثاق اور ان کے نتائج و عواقب کے واقعات عہد نبوت کی تاریخ میں بےشمار نظر آتے ہیں اور ان کے اندر اخلاق قرآنی کی عملی صورت دیکھی جاسکتی ہے۔

ظالم دشمنوں سے سلوک

سب سے پہلی چیز اس سلسلے میں وہ اخلاقی سلوک ہے جو آنحضرت (ﷺ) نے غیر قوموں اور حریفانِ جنگ سے کیا۔ ان قوموں نے معاہدوں کو اکثر توڑا ہے اورنہایت شرمناک طریقے سے غداریاں کی ہیں ۔

رعل، ذَکوان، عُصّیہ اور بنو لِحَیان کے قبائل نے آنحضرت ﷺ سے کسی دشمن کے مقابلے کے لیے فوجی مدد کی درخواست کی ہے[1] آنحضرت ﷺ نے قراءصحابہ میں سے ستّر صحابی ساتھ کردیے لیکن بئرمعونہ پر لے جاکر ان لوگوں نے بیوفائی کی اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کردیا۔

---

[1] واقعہ یوں ہے کہ قبیلہ کلاب کے رئیس نے رسول اللہ سے درخواست کی تھی کہ چند لوگ میرے ساتھ کر دیجیے جو میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں ۔ آپ نے فرمایا کہ میں نجد کی طرف سے مطمئن نہیں ۔ رئیس کلاب نے نجد کی طرف سے ذمہ داری اٹھالی اور رسول اللہ ﷺنے صحابی بھیج دیے۔ رئیس کلاب نے بئر معونہ پہنچ کر غداری کی۔ آس پاس کے قبائل مثلاً رعل،عصیہؓ ،ذَکوان گؓ پاس آدمی دوڑائے کہ تیار ہوکر آؤ۔

جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی فوج کو قبیلہ بنو لِحیان کے دوسو تیر اندازوں نے گھیر لیا تو ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ نیچے اتر آئیں تو کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس پر ایک جماعت اتر آئی، لیکن بعض صحابہ کو اسی جگہ قتل کردیا گیا اور بعض کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔[2]

ذاتی وفائے عہد

بہ ایں ہمہ غدرو بے وفائی، آنحضرت ﷺ کا جو معیار اخلاق شخصی حالتوں میں تھا، وہی میدانِ جنگ میں بھی قائم رہا۔ شخصی حالت میں آپ ﷺ کے وفائے عہد کا یہ حال تھا:

عن عبداللّٰہ بن ابی الحمساء قال بایعت النبی ﷺ ببیع قبل ان بعث، و بقیت لہ بقیة فوعدتہ ان اٰتِیَہ بہا فی مکانہ فنسیت فذکرت بعد ثلاث فجئت، فاذا ھوفی مکانہ، فقال یافتی لقد شققت علیّ انّا ھٰہُنا منذ ثلاث انتظرکُ[1]

"عبداللہ بن حمساء کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ ان کے مبعوث ہونے سے پہلے میں نے ایک چیز فروخت کی، جس کا کچھ حصہ آپ ﷺ کے حوالے نہیں کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ آپ ٹھہریے، میں اسی جگہ لے کے آتا ہوں مگر میں گھر جاکر بُھول گیا اور تین دن کے بعدا پنا وعدہ یاد آیا، پلٹ

---

[2] یہ واقعہ رجیع ہے۔ جس میں عضل اور قارہ کے قبیلوں نے تعلیم اسلام کی غرض سے چند آدمی طلب کیے تھے اور دس آدمی بھیجے گئے تھے۔ جن کا رئیس حضرت عاصم بن ثابت کو مقرر کیا گیا۔ان قبیلوں نے بھی غداری کی۔

[1] (ابو داؤدجلد :۲ صفحہ: ۳۲۶ کتاب الادب)

کہ آیا تو دیکھا کہ آپ ﷺ اسی جگہ ہیں ۔ آپ ﷺ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ تم نے مجھے بڑی تکلیف دی۔ میں تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں ۔ “

مجاہدین کو وصّیت

جہاد اسلامی کی وسعت نے آپ ﷺ کی اخلاقی طاقت کو اور بھی مستحکم و استوار کردیا۔ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جب مجاہدین جہاد کے لیے روانہ ہوتے تو آپ ﷺ ان کو مخاطب کرکے ایک عام وصّیت فرماتے جو متعدد اخلاقی ہدایات کا مجموعہ ہوتی تھی۔ انہی ہدایات میں ایک حکم پابندی عہد کا بھی تھا:

کان رسول اللّٰہ ﷺ اذا امّر امیرا علی جیش اوسریة اوصاہ خاصة بتقوی اللّٰہ عزوجل ومن معہ من المسلمین خیرا، ثم قال اغزوا باسم اللّٰہ فی سبیل اللّٰہ، قاتلوا من کَفَر باللّٰہ اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلو ولا تقتلوا ولیدا ۔ ❷

”آنحضرتﷺ جب کسی شخص کو کسی فوج کا سپہ سالار مقرر فرماتے اسے خدا سے ڈرنے اور مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرتے ، پھر فرماتے کہ خدا کی راہ میں خدا کا نام لے کر لڑو! جن لوگوں نے خدا کاانکار کیا ہے، ان سے جہاد کرو لیکن مال غنیمت میں کسی قسم کی خیانت نہ کرنا، عہد کی پابندی کرو، بیوفائی نہ کرو، کسی کے ہاتھ ، پاؤں ، کان،

❷ (صحیح مسلم جلد:۲ ص:۶۲ کتاب الجہاد)

ناک نہ کاٹو! بچوں کو قتل نہ کرو۔“

مجاہدین عموماً ان احکام پر عمل کرتے تھے اوریہی اخلاقی ہدایت تھی جو ان کو ہر قسم کے بے اعتدا لا نہ جنگی افعال سے روکتی تھی۔

حضرت خُبیَب رضی اللہ عنہ کا واقعہ

لیکن ان ہدایات میں پابندی عہد پر مسلمانوں نے جس شدت کے ساتھ عمل کیا، اس کی نظیر دنیا کی اخلاقی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ حضرت خُبَیب رضی اللہ عنہ اور ابن دثنہ کو قبیلہ بنی لِحَیان نے امان دے کر پہاڑ سے اتروایا،[1] پھر بد عہدی کی اور انہیں غلام بنا کر بیچ ڈالا، عام طور پر جب نقض عہد میں ایک فریق کی طرف سے پیش قدمی کی جاتی ہے تو دوسرا فریق ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہوجاتا ہے اور تمام معاہدوں کو توڑ سکتا ہے، اس لیے خُبیب رضی اللہ عنہ اگر اس وقت ان ہدایات کی پابندی نہ کرتے تو وہ معذور سمجھے جا سکتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ کے احکام جبری احکام نہیں ہوتے تھے بلکہ آپ ﷺ کا روحانی اثر ان کو مجاہدین کے رگ وپے میں ساری کردیتا تھا۔ جب خُبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر نے خریدلیا اور حرم کے باہر قتل کرنا چاہا تو انہوں نے حارث کی لڑکی سے استراطلب کیا۔

---

[1] یہ واقعہ رجیع کا ایک حصہ ہے۔ رجیع عسفان اور مکہ مکرمہ کے وسط میں ایک مقام ہے۔

لڑکی نے استرا ان کے ہاتھ میں دینا چاہا تو حضرت خُبَیب رضی اللہ عنہ نے اسے گود میں بٹھالیا، اتفاقیہ بچی کی ماں آگئی ڈری کہ جو شخص جان سے ہاتھ دھو چکا ہے اسے کسی کی جان پر حملہ کرنے میں کیا تامل ہوسکتا ہے؟ حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ جان سے ہاتھ دھوچکے تھے اور ہاتھ میں ایک ہتھیار (استرا) بھی تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے بچوں کے قتل نہ کرنے کا جو عہد ان سے لے لیا تھا، وہ انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا چنانچہ ماں کی سراسیمگی دیکھ کر اس سے کہا: کیا تم کو ڈر ہے کہ میں اس بچی کو قتل کردوں گا! نہیں ، تم ایسا نہ سمجھو،میں ایک بچہ کا خون اپنی گردن پر نہیں لے سکتا۔❷

ان اخلاقی احکام سے زیادہ خود آنحضرت ﷺ کے طرزِ عمل نے صحابہ رضی اللہ علیہم اجمعین کو پابندی عہد کی تعلیم دی تھی، یہود خیبر نے آنحضرت ﷺ کو زہر دے دیا، لیکن آپ ﷺ نے کسی قسم کا انتقام نہ لیا، آنحضرت ﷺ پر یہودیوں نے جادو کیا، لیکن آپ ﷺ نے معاہدہ کی بنا پر انہیں معاف کردیا۔

حُدیبیہ کے بعد کا ایک واقعہ

آنحضرت ﷺ نے جب کفّارِ مکہ سے بمقام حُدیبیہ صلح کرلی تو صلح کے بعد مسلمانوں اور کافروں میں باہم میل جول ہوگیا، حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

میں اس حالت اطمینان میں ایک درخت کے

---

❷ بخاری جزو: ۵

نیچے جاکر لیٹ گیا، اتفاق سے میرے پاس چار مشرک آگئے اور آنحضرت ﷺ کی مذمت کرنے لگے، میں آپ ﷺ کی ہجو نہ سن سکا اور اٹھ کردوسرے درخت کے سایہ میں چلا گیا، وہ سب درخت کی شاخ میں ہتھیار لٹکا کر لیٹ گئے، اس حالت میں دفعتًہ غل ہوا کہ ابن زنیم قتل کردیا گیا، میں نے تلوار میان سے کھینچ لی اور انھی چاروں پر حالتِ خواب میں حملہ کیا پہلے ان کے ہتھیاروں پر اچھی طرح قبضہ کرلیا پھر ان سے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو برگزیدہ کیا ہے، تم میں سے جو شخص سر اٹھائے گا اس کی گردن اڑادوں گا، پھر ایک طرف سے میں ان چاروں کو اور دوسری طرف سے میرے چچا عامر ایک دوسرے کافر کو جس کا نام مِکَرز تھا، گھسیٹتے ہُوئے آنحضرت ﷺ کے پاس لائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں بالکل معاف کردیا اور فرمایا: انہیں چھوڑدو،برائی کی ابتدا انہی کی طرف سے ہونی چاہیئے۔[1]

اگرآنحضرت ﷺ انہیں قتل کردیتے تو درحقیقت اس بدعہدی کے ذمہ دار خود وہی لوگ ہوتے، لیکن آپ ﷺ نے نقض عہد کی اس ظاہری شکل کو بھی گوارا نہ کیا، جو ان کے اقدام قتل سے پیدا ہوتی تھی۔

احکام شریعت کے تین درجے

اسلام نے احکامِ شریعت کے تین درجے قراردیے ہیں :

---

[1] صحیح مسلم جلد:۲

الحلال بیّنٌ والحرام بیّنٌ وما بینهما مشتبهات۔
(الحدیث)

"حلال بھی کھلا ہُوا ہے اور حرام بھی، البتہ ان کے درمیان چند مراتب ایسے ہیں جو حلت وحرمت دونوں کا احتمال رکھتے ہیں ۔"

یہی مشتبہات درحقیقت زہد و تقویٰ کی آزمایش ہیں ۔ایک خداترس شخص ایک کھلی ہوئی نیکی پر عمل کرسکتا ہے، ایک فریبی دکھلاوے کے لیے کسی صریح برائی سے اجتناب کرسکتا ہے، لیکن نیتوں کا کھوٹ وہاں نہیں چھپ سکتا جہاں حلال و حرام کے نہایت نازک درمیانی مقامات ہیں ۔ تمام حِیَل شرعی انھی کے محور پر گردش کرتے ہیں ۔

ذاتی انتقام کبھی نہ لیا

آنحضرت ﷺ زہر دینے والے اور سحر کرنے والے یہودیوں کو قتل کرسکتے تھے۔ آپ ﷺ ان کفار سے بھی انتقام لے سکتے تھے جنھوں نے صُلح حُدیبیہ کے بعد ہجوو غیبت بلکہ کُشت و خون کی طرف قدم بڑھایا۔ بہ ایں ہمہ آپ ﷺ نے انہیں معاف کردیا، کیونکہ ان بد عہدیوں پر اشتباہ کے متعدد پردے پڑے ہوئے تھے۔ ان سے ذاتی انتقام کی بُو آتی تھی اور خلق عظیم کے تمام ابوابِ اخلاق میں سب سے زیادہ نمایاں باب یہ ہے کہ:

لم ینتقم لنفسہ (صحیحین) "آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلانہ لیا۔"

ایسا کرنے سے اگرچہ حقیقی طور پر نقض عہد نہیں ہوسکتا تھا، تاہم بظاہر نقض عہد کا

شبہ پیدا ہوسکتا تھا۔ اسلام اپنے دامن پر اس قسم کا ظاہری دھبہ بھی نہیں دیکھ سکتا!

صحابہ ضنللہعلیہمجمعین کا اتباع

آپ ﷺ کے طرز عمل نے صحابہ ضنللہعلیہمجمعین کے لیے بھی پابندی عہد کا ایک بلند ترمعیار قائم کردیا تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں ہمیشہ اسے قائم رکھا۔

عہد صحابہ ضنللہعلیہمجمعین میں جب کبھی نقض عہد کا ظاہری احتمال بھی پیدا ہوا تو لوگوں نے علانیہ اس کا انکار کیا۔ امیر معاویہ ضنللہعنہ نے رومیوں سے ایک مدت کے لیے معاہدہ صلح کرلیا تھا۔ وہ اگرچہ نقض عہد کرنا نہیں چاہتے تھے، تاہم انہوں نے زمانہ صلح ہی میں رومیوں سے لڑنے کے لیے تیاریاں شروع کردیں اور فوج لے کر ان کی طرف بڑھے کہ مدت صلح گزرجانے کے ساتھ ہی جنگ شروع کردیں گے۔ اسی حالت سفر میں ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچا اور کہا: اللہ اکبر! اللہ اکبر! کیا یہ بد عہدی تمہارے شایان شان ہے؟ تم کو وفا ء عہد کرنا چاہئے۔ لوگوں نے تعجب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عمر ضنللہعنہ بن عنبسہ ہیں ۔ امیر معاویہ ضنللہعنہ کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور ان سے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے:

من کان بینہ و بین قوم عہد فلا یشدّ عقدۃ ولا یحلہا حتٰی ینقضی احدھا او ینبذ الیھم علٰی سواء۔

”اگر کوئی شخص کسی قوم سے معاہدہ کرے تو اس معاہدہ کی گرہ نہ باندھے اور نہ کھولے (یعنی اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے اور اسے اپنے حال پرقائم رہنے دے، یہاں تک کہ معاہدہ صلح کی پوری مدت گزرجائے یا باہمی معاہدہ کے توڑنے کا عام اعلان کردیا جائے۔“

چنانچہ امیر معاویہ ضللہعنہ راستہ ہی سے لوٹ آئے۔(ابو داؤد)

پابندی عہد کا کمال

سلطنتوں میں باہم معاہدے ہوتے ہیں اور وہ قائم بھی رکھے جاتے ہیں ، لیکن کوئی سلطنت اپنے معمولی مقاصد کی کامیابی کو بھی عہد وفا کی اخلاقی پابندی پر قربان نہیں کرسکتی۔ یورپ کا موجودہ اخلاق اس کے لیے کافی شہادت ہے۔ اٹلی نے اپنے عالم آشکار عہد کو چند لمحوں کے اندر فراموش کردیا[1] اور جرمنی پیرس کی طرف بڑھنے کو اس قدر ضروری سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے بیلجیم کی نا طرفداری کوئی شے نہیں ہے[2] اسلام کا مقصد پیرس کے قلعوں کی

---

[1] مطلب یہ کہ اٹلی کا معاہدہ جرمنی اور آسٹریا سے تھا مگر پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء ۱۹۱۸ء) میں وہ اپنے حلیفوں کو چھوڑ کر برطانیہ و فرانس سے مل گیا۔

[2] پہلی عالمی جنگ میں فرانس پر حملہ کے لیے جرمنی کوبیلجیم میں سے گزرنا مناسب معلوم ہوا اور اس نے بیلجیم کی غیر جانبداری کی کوئی پروا نہ کی۔دوسری عالمی جنگ میں بھی جرمنی نے بیلجیم،ڈنمارک،ہالینڈ کی غیر جانبداری کو خس برابر بھی وقعت نہ دی۔ اتحادیوں کو ایران کے راستہ روس سامان بھیجنا مناسب نظر آیا تو ایران کی غیر جانبداری ان کے لیے سدّ راہ نہ ہوئی۔

برجیوں سے زیادہ بلند تھا ، لیکن اس نے پابندی عہد پر اپنے عظیم الشان مقصد کوبارہا قربان کردیا ہے۔ اسلام کا مقصد حقیقی اشاعت حق تھا، اسی کے لیے وہ لڑتا تھا، اسی کے لیے صلح کرتا تھا، اسی کے لیے معاہدہ کرتا تھا، یہ مقصد کبھی کبھی بغیر کسی قسم کی جدوجہد کے بھی حاصل ہوجاتا تھا اور تلوار کی جگہ صرف داعی اسلام کی روحانی طاقت ہی اس میدان کو فتح کرلیتی تھی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ایسے اعلیٰ مقصد کو بھی، جو نہایت آسانی سے حاصل ہوسکتا تھا، معاہدہ کی اخلاقی پابندی پرترجیح نہ دی ۔ قریش نے ایک شخص کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں قاصد بناکر بھیجا ۔ وہ آپ ﷺ کی صورت مبارک دیکھتے ہی اسلام کی طرف مائل ہوگیا اور بے اختیار پکاراٹھا "اب اس چوکھٹ کو چھوڑ کر قیامت تک نہ جاؤں گا" لیکن چونکہ قاصدوں کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جاتا اور ان کے ساتھ ایک خاص معاہدہ کی پابندی لازمی ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: میں عہد شکنی نہیں کرسکتا۔ تم سردست تو واپس جاؤ۔ اگر تمہارے دل میں اسلام کی محبت ہے۔ تو پھر واپس آسکتے ہو۔ وہ پیغام لے کر گیا، پھر پلٹ کر آیا اور اسلام لایا۔ (ابو داؤد)

صلح حدیبیہ

مشرکین نے صلح حدیبیہ میں جو شرطیں پیش کی تھیں ، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ"کفار مکہ میں سے جو شخص مسلمان ہوکر مدینے بھاگ جائے گا، اسے مسلمان واپس کردیں

گئے" اس شرط پر باہم سخت اختلاف ہوا۔ صحابہ رضی اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ ایک مسلمان کو کیونکر کفار کے حوالے کیا جاسکتا ہے؟ ابھی اس شرط کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ابُو جَنَدل رضی اللہ عنہ ابن سہیل بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے مکے تک پہنچے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے پاؤں پر ڈال دیا۔ ابو جَنَدل رضی اللہ عنہ کا باپ سہیل تھا اور وہی اس وقت قریش کی طرف سے معاہدے کے لیے آیا تھا۔ سہیل نے کہا کہ میں اپنے بیٹے کی واپسی پر صلح کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تک معاہدہ صلح مکمل نہیں ہوا۔ اس لیے اس کی پابندی ہمارے لیے ضروری نہیں ، مگر اس نے کہا کہ اس کے سوا کسی دوسری بات پر صلح نا ممکن ہے۔ آپ ﷺ نے مکرراصرار کیا کہ کم از کم ابو جندل رضی اللہ عنہ کو تو اس شرط سے مستثنیٰ کردو، مگر سُہیل نے صاف انکار کردیا۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ نے تمام مسلمانوں سے نہایت درد انگیز لہجے میں کہا کہ "مسلمانو! میں مسلمان ہوکر آیا ہوں ، کیا اب پھر مشرکین کی طرف واپس کیا جاؤں گا؟ ان الفاظ نے صحابہ کے مذہبی جذبات میں آگ لگادی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے اختیار اٹھ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ کیا آپ پیغمبر خدا اور آپ کے ساتھی بر سرِ حق نہیں ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک حق پر ہیں ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر ہم کیوں اس قدر دب رہے ہیں اور ذلت گوارا

کـر رہے ہیں ؟ آپ ﷺ نے جـواب دیـا کہ اللہ کـا حکم ایسا ہی ہے۔

لیکن حضرت عمـر رضی اللہ عنہ کـو اس سـوال و جواب سـے تسـکین نہ ہُـوئی اور انہوں نےحضـرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سـے بھی اسـی قسـم کی گفتگـو کی۔ تـاہم کچھ نـتیجہ نہ نکلا اور آنحضـرت ﷺ نے قریش کی تمام شرطیں منظور کرکے صـلح نـامہ مرتب کردیا اور دستخط ہوگئے۔

ابُو بَصیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

اس کے بعد جب آنحضرت ﷺ مدینہ کو روانہ ہُوئے تو ساتھ ساتھ ابو بَصیر[1] بھی مسلمان ہوکر مکہ سـے نکـل آئے۔ قـریش نے انکی جسـتجو میں دو آدمی بھیجے اور شـرائط صـلح یـاد دلائیں ۔ آنحضـرت ﷺ نے فـوراً ابوبصـیر رضی اللہ عنہ کـو واپس کردیـا۔ وہ ان کـو لے کـر چلے تـو مقـام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر کھجوریں نکالیں اور کھانے پینے میں مشغول ہوئے ۔ ابـو بَصِـیر رضی اللہ عنہ نے اس موقـع پربلطائف الحیل ان کے پھندے سـے نکلنـا چاہا۔ وہ کھجـور کھـانے میں مصـروف تھے۔ ابـو بصـیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کی تلوار کی طـرف دیکھ کـر کہا: کتـنی اچھی تلـوار ہے۔ اس نے داد پـاکر تلوار کھینچ لی اور کہا بے شبہ ، میں اس کابارہا تجربہ کر چکـا ہوں ۔ ابـو بَصـیِر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ بڑھا کر دیکھنے کے بہانے لے لی اور سـب سـے پہلے اسی شخص کی گردن قلم کردی۔ دوسرا شـخص

[1] ان کا نام عتبہ بن اَسِید تھا۔

یہ حالت دیکھ کر بھاگا اور دوڑتا ہُوا مدینہ پہنچا۔آنحضرت ﷺ نے اس کی پیشانی دیکھی تو فرمایا: اس پر کوئی مصیبت آگئی ہے۔ اس نے کہا: میرا ساتھی تو قتل کردیا گیا ہے اور میں بھی قتل کے قریب پہنچ گیا تھا۔"

ایک جمیعۃ کی فراہمی

اسی حالت میں ابو بَصیِرضللہعنہ بھی پہنچے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ "آپ نے اپنا عہد پورا کرکے مجھے واپس کردیا۔ اب خدا نے مجھے نجات دی ہے، آپ اس کے ذمہ دار نہیں ہیں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "یہ شخص تو لڑائی کا شعلہ معلوم ہوتا ہے۔" ابو بصیر ضللہعنہ نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ ﷺ دوبارہ مجھے واپس کردیں گے۔ چنانچہ وہ مدینہ سے بھاگ کر سمندر کے کنارے مقیم ہوگئے۔ ابو جندل ضللہعنہ کو خبر ہُوئی تو وہ بھی ان سے جا ملے، یہاں تک کہ قریش کا جو شخص مسلما ن ہوتا تھا وہ بھاگ کر ابو بصیر ضللہعنہ کے دامن میں پناہ لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ابو بصیر ضللہعنہ نے ایک اچھی خاصی جمیعۃ قائم کرلی اور قریش کے کاروان تجارت کو جو شام کی طرف جاتا تھا، عام طور پر لوٹنا شروع کردیا۔ بالآخر قریش نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے ابو بصیر ضللہعنہ وغیرہ کو بلا لیا۔ (بخاری)

جنگ میں بھی عہد کی پابندی

عموماً زمانہ جنگ میں معاہدوں کی پابندی نہیں کی جاتی اور اشخاص کے باہمی معاہدے تو صلح کی حالت میں بھی کوئی جمہوری وقعت نہیں رکھتے، لیکن اسلام کی جمہوریت اور شخصیت دونوں ایک ہی روحانی طاقت کے تابع تھیں ۔ اس لیے زمانہ جنگ میں اشخاص کے مجبورانہ معاہدوں کو بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا جاتا تھا۔ حذیفہ بن یمان کا بیان ہے کہ "میں غزوہ بدر میں صرف اس لیے نہیں شریک ہوسکا کہ میں اور ابوجندل رضی اللہ عنہ ساتھ چلے تو کفار قریش نے ہمیں گرفتار کرلیا اور کہا کہ تم محمدﷺ کے پاس جاتے ہو؟ ہم دونوں نے کہا کہ نہیں ، ہم صرف مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے عدم شرکت جہاد کا معاہدہ لے کر ہمیں چھوڑدیا۔ ہم آنحضرتﷺ کی خدمت میں حاضرہوئے اور شریک جہاد ہونا چاہا لیکن آپﷺ نے فرمایا : تم لوگ مدینہ کو واپس جاؤ، ہم کفار کے معاہدوں کو پُورا کرتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں صر ف خدا سے مدد چاہتے ہیں ۔ [1]

فراخ دلی اور فیاضی

ایفائے عہد کے متعلق سب سے بڑی بحث یہ ہے کہ کس کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیے اور کس کے ساتھ قائم رکھنا چاہیے؟ یونان کے مقنن اعظم سولن نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا ہے اور وہی تمام دنیا کی سیاسیات کی روح ہے

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۸۹

یعنی "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے، جو اپنے سے کمزور کو تو اُلجھا لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے مقابلے میں ٹوٹ جاتا ہے۔" لیکن اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جس کے اخلاقی معاہدوں نے سولن کے اس تارعنکبوت کو توڑدیا۔ اسلام ضعیفوں کے ساتھ فیاضانہ معاہدہ کرتا ہے اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھتا ہے۔ آنحضرتﷺ نے کفار قریش سے بہ مقام حدیبیہ جو صلح کی تھی، وہ بظاہر نہایت عاجزانہ و مجبورانہ صلح معلوم ہوتی ہے۔ خود صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس کا احساس کیا تھا اور آپﷺ نے بھی نہایت صراحت کے ساتھ فرمادیا تھا:

لایسالون خطة یعظمون فیها حرمات اللّٰہ الاّ اعطیتهم۔

"میرے سامنے وہ جو شرط پیش کریں گے میں اسے قبول کرلوں گا، بشرطیکہ اس سے شعائر الٰہی کی توہین نہ ہو۔"①

چنانچہ آپﷺ نے اپنے گوہرمقصود یعنی ان مسلمانوں کو جو نورِ ایمان سے لبریز ہوکر آتے تھے، واپس کرنے کا عہد کرلیا۔ آنحضرتﷺ نے صلح نامہ پر "بِسم اللّٰہ" لکھنا چاہا۔ کفارنے اس سے انکار کیا، لیکن آپﷺ نے باوجود صحابہ

---

① حقیقت یہ ہے کہ قریش لڑائیوں کے ذمہ دار تھے جو اسلام کو بہ جبر و قوت مٹانے کے درپے تھے۔ صلح حدیبیہ میں وہ جنگ سے دست بردار ہو رہے تھے۔ یہ اسلام کے لیے فتح مبین تھی ۔ لٰہذا اس بنیادی اور اساسی فتح کے سلسلے میں ہر شرط قبول کی جاسکتی تھی ۔البتہ شعائر الٰہی کی حرمت کا لحاظ لازم تھا۔

ضنللہعلیہمجمعین کے اصرار کے کفار کی خواہش پوری کردی اور "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" کی جگہ "باسمک اللھم" لکھا، آپ ﷺ نے اپنے نام کے ساتھ "رسول اللّٰہ" لکھنا چاہا، کفار نے کہا: اگر ہم آپ ﷺ کو رسول اللہ مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا؟ صرف محمد بن عبداللہ لکھیے، "معاہدے پر رسول اللہ کا لفظ لکھا جاچکا تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے حضرت علی ضنللہعنہ کو حکم دیا کہ "اسے مٹادو" ان کے جوش ایمان نے اسے گوارا نہ کیا تو آپ ﷺ نے خود مٹادیا۔

اس سے زیادہ کمزوری اور کیا ہوسکتی ہے؟ لیکن کیا درحقیقت آپ ﷺ مجبور تھے؟ کیا قریش کی عظیم الشان طاقت نے آپ ﷺ کو بالکل بے دست وپاکردیا تھا؟

صلح و امن

تمام سلطنتیں نقض عہد کے لیے ضعف کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں اورصلح تو ہمیشہ قوی ہی کے ساتھ کی جاتی ہے، لیکن اسلام کی امن پسندی نے ایک نہایت ضعیف گروہ کے مقابلہ میں یہ فیاضانہ صلح کی اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا، چنانچہ آپ ﷺ نے خود فرمایا:

انا لم تجئی لقتال احد و لکنّا جئنا معتمرین و ان قریشاً قد تھلکّھم الحرب و اخرت بہم فان شاؤ اشاورتہم مدۃ۔

" ہم کسی سے لڑنے بھڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں صرف عمرے کے لیے آئے ہیں ، قریش کو متواتر

لڑائیوں نے چور چور کردیا ہے۔ اور ان کی طاقت کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ بہ ایں ہمہ وہ چاہیں تو ہم ایک مدت کے لیے ان سے صلح کر سکتے ہیں ۔“

دنیوی سلطنتوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اس بہترین موقع سے کیا کا م لیتیں ؟ انعقاد صلح کا یا اشتعال جنگ کا؟ دنیا کی قدیم و جدید تاریخ اس کا نہایت آسانی کے ساتھ جواب دے سکتی ہے۔ اگر اس حالت میں کوئی سلطنت صلح بھی کرتی تو اس کا نتیجہ جنگ سے زیادہ درد انگریز ہوتا ۔

اہل نجران سے معاہدہ

لیکن یہ جزئی طرز عمل صرف اختلافی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلام کی وسعت ایک مستقل اور جامع ہدایت کی محتاج تھی، جو اس اخلاقی طرز عمل کے ساتھ اپنے اند رایک قانونی طاقت بھی رکھتی تھی اور جب پچھلوں کی اخلاقی طاقت آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو بھلادیتی تو وہ اپنی جزئی طاقت سے اس کو یاد دلاتی۔ آنحضرت ﷺ نے غیر قوموں کے ساتھ جو تحریری معاہدے کیے ہیں وہ بالکل قانونی اور سیاسی حیثیت رکھتے ہیں ۔ لیکن ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس باب میں اسلام کا قانون کس قدر فیاضانہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے بخران کے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا ، اس کے الفاظ یہ ہیں :

علی اهل نجران الفی حلة النصف فی صفر والنصف فی رجب یردونہا الی المسلمین و عاریة ثلاثین درعا و ثلاثین بعیراو ثلثین من کل صنف

من اصناف السلاح یغزون بہا و المسلمون ضامنون لہا حتی یردوھا علیھم ان کان بالیمن کید ذات غدر علی ان لا تھدم لہم بیعۃ ولا یخرج لہم قس ولا یفتنوعن دینھم۔ (ابوداؤد جلد : ۲ ص: ۷۵)

"اہل بخران کو دو ہزار حلے باقساط دینا پڑیں گے۔ ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہ رجب میں اور ان کو تیس زرہیں ، تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور ہر قسم کے ہتھیار بطور عاریت کے بھی دینے ہوں گے۔ اگر یمن میں کوئی جنگ ہوگی تو وہ لوگ ان چیزوں کو واپس کردیں گے اور اس معاہدے کی بنا پر نہ تو ان کے گرجے گرائے جائیں گے، نہ ان کے کسی پادری کو جلا وطن کیا جائے گا اور نہ ان کے مذہب سے کوئی تعرض ہوگا۔"

اخلاقی نصائح

لیکن اسلام کا ہر قانون اپنے اندر اخلاقی رُوح بھی رکھتا ہے۔ آنحضرتﷺ نے اخلاقی نصائح سے اس کو اور بھی موثر بنادیا:

الامن ظلم معاھدا اوانتقصہ اوکلفہ فوق طاقۃ او اخذ منہ شیئا بغیر طیب نفس فانا حجیجتہ یوم القیامۃ۔ (ابو داؤد جلد:۲ ص: ۷۷)

" خبردار، اگر کسی نے کسی غیر مذہب رعیت پر ظلم کیا، یا اس کی تنقیص کی یا اس کی کوئی چیز بہ جبرلے لی۔ اگر ایسا ہوا تو میں اس کی طرف سے قیامت کے دن خدا کے سامنے جھگڑوں گا۔"

ایک قبطی کا واقعہ

صحابہ رضی اللہ علیہم اجمعین نے آنحضرت ﷺ کے بعد اس فیاضانہ طرز عمل کو نہایت بے تعصبی کے ساتھ قائم رکھا چنانچہ ہشام ابن حکیم نے حمص کے عامل کو دیکھا کہ قبطیوں کو دھوپ میں بٹھا کر جزیہ وصول کررہا ہے۔ انہوں نے اسی وقت آنحضرت ﷺ کی یہ اخلاقی نصیحت یاد دلائی۔

ان اللّٰہ یعذب الذین یعذبون الناس فی الدّنیا۔

” خدا قیامت میں ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں انسانوں کودُکھ پہنچاتے ہیں ۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیّت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اسی اخلاقی قانون کی تجدید کی تھی:

واوصیت بذمة اللّٰہ وذمة رسولہ ﷺ ان یو فی لہم
لعهدهم وان یقاتل من ورائهم
ولا یکلّفوا الا طاقتهم۔ (بخاری جزو : ۴ ص: ۶۹)

”میرے بعد جو خلیفہ ہوگا میں اس کو خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے معاہدے کی حفاظت کے لیے وصیت کرتا ہوں ، وہ وصیت یہ ہے کہ غیر مذہب رعایاسے جو معاہدہ کیا جائے وہ پورا کیا جائے۔ ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیے لڑائی کی جائے اور ان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا جائے جس کے وہ متحمل ہوں ۔“

فاتح اور پیغمبر کا فرق

جہاد اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے، اس کے لحاظ سے وہ دنیوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف اس قدر بدیہی ہے کہ ہم کو اس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خط و خال کے اندر نمایا ں طور پر نظر آسکتا ہے۔

ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادے سے میدان جنگ کا رخ کرتا ہے تو طبل و دہل کے غلغلے اور قرناءدبوق کے ترانے خیر مقدم بجالاتے ہیں ، سر پرپرچم لہراتا ہے، چتر شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اس کی طرف نگاہِ گرم سے دیکھنے نہیں دیتا، جاہ و جلال کا یہ دیوتا میدان جنگ میں ایک مجسمے کی طرح کھڑا کردیا جاتا ہے اور تمام فوج اسی مرصیع بت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے، عظمت و جبروت کا یہ منظر دنیا کو دفعتہ مرعوب کردیتا ہے اور اس رعب و داب کے احساس سے اس دنیوی فتح کا سربادۂ کبر و نخوت سے لبریز ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ خاک و خون میں مل کر بھی یہ نشہ نہیں اترتا، اگر کوئی اس سر پر غرور کو ٹھکرادیتا ہے تو اس سے مغرور انہ صدا بلند ہوتی ہے۔

پیغمبر کا سفر

لیکن ایک پیغمبر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو اگرچہ مخلصین و مومنین کی ایک جماعت اس

کے ساتھ ہوتی ہے لیکن وہ اپنا رفیق سفر صرف خدا کو بناتا ہے:

کـــان رســـول اللّہ ؐ اذا ســـافر قـــال اللھم انت الصاحب فی السفر و الخلیفـة فی الا ھـل! اللھم اِنی اعوذبـک من و عثاءالســفر وکابــة المنقلب و ســـوءالمنظر فی الاھـــل والمـــال اللھم اطولنـــا الارض وھون علینا الضر!

” آنحضرت ؐ جب بغرض جہاد روانہ ہوتے تھے تو یہ دعا کـرتے تھے، خـدا یـا! تـوہی ہمـارا رفیـق سفر ہے، تو ہی ہمارے بال بچوں میں ہمارا قائم مقام ہے۔ خدایا!سفر کے شدائد اورپلٹ کـر اہل و عیال کـو بُـرے حـال میں دیکھـنے کی مصـیبت سـے پنـاہ مانگتـا ہوں ، خـدایا مسـافت سـفر کـو کم کردے اور ہمارے لیے آسان بنادے۔“

سواری

وہ سواری کی پشت پر قـدم رکھتـا ہے توخـدا کا شکر ادا کرتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ ۝۱۳۝

(الزخرف:۱۳)

” کیـــا پـــاک و برتـــر ہے وُہ خـــدا جس نے اس سواری کو ہمـارا فرمـانبردار بنادیـا ورنہ ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے تھے“

سفر سے واپسی

وُہ سفر سے پلٹتا ہے تو راہ میں خدا کی حمد کا ترانہ گاتا ہوا چلتا ہے:

آئبون تائبون عابدون لِرَبّنا حامِدون![1]

”ہم لوٹ کر آنے والے ہیں ، ہم توبہ کرنے والے ہیں ہم خدا کے عبادت گزار بندے ہیں اور ہم اپنے رب کی حمد ثنا کرتے ہیں ۔“

پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتا ہے تو غلغلۂ تکبیر بلند کرتا ہے، نیچے اترتا ہے تو ترنم ریز تسبیح وتہلیل ہوتا ہے۔

فوج کی روانگی

فوج کو روانہ کرتا ہے تو اسے نہ غرور و طاقت کی یاد دلاتا ہے، نہ اس کے جوش کو دو آتشہ کرتا ہے، نہ قدیم کارنامہ ہائے شجاعت کا تذکرہ کرکے اس کے دل کو گرماتا ہے، بلکہ اس کے دین کو، اس کی امانت کو، اس کے تمام نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کرکے رخصت کردیتا ہے:

استودع اللّٰہ دینکم و امانتکم و خواتیم اعمالکم۔

---

[1] یہ بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ یا حج یا عمرہ سے لوٹتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر فرماتے:
لاالٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہٗ الملک ولہٗ الحمد و ھو علیٰ کل شیٍٔ قدیر،آئبون، تائبون، عابدون، ساجدون،لربنا حامدون صدق اللّٰہ وعدہٗ و نصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ۔

”خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ، کوئی اس کا شریک نہیں ، ملک اسی کا ہے، ستایش اسی کے لیے ہے اور وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے ہم لوٹ کر آنیوالے ہیں ، تائب ہیں ، عبادت گزار ہیں ، اپنے پروردگار کی حمد کرتے ہیں اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے ہی تمام احزاب یعنی گروہوں اور لشکروں کو شکست دی ۔“ (کتاب المغازی،باب غزوہ احزاب)

”میں تمہارے دین ، تمہاری امـــــانت اور تمہارے نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کرکے تمہیں خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے بھیجتا ہوں ۔“

منزل پرنزول

وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ سلاطین کی طرح اس کے لیے خیمے قائم کیے جـاتے ہیں ، نہ فـرش و بساط شـاہانہ سـے زمین آراسـتہ ہوتی ہے اور نہ میدان کا نشیب و فراز ہموار کیا جاتا ہے۔ وہ خدا کا نام لے کر فرش خـاک پـر لیٹ جاتـا ہے اور اس نام کی عظمت کے سہارے پـر زمین ہی کـو اپـنی حفاظت کی خدمت سُپرد کردیتا ہے:

یا ارض ربّی وربک اللّٰہ اعوذ باللّٰہ من شرک و شرِ ما فیک و من شرّ ما یدبّ علیکہ

”اے زمین! میرا اورتـیرا، دونـوں کـا خـدا ایـک ہی ہے۔ میں تیرے شر سے،تیری سطح باطنی کے شـــر سـے اور تجھ پـر چلـنے والـوں کے شـر سـے ، پنـاہ مانگتا ہوں ۔“

جہاد سے مراجعت

وہ سفر جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتـا ہے تـو سـب سـے پہلے اسـے خـدا کـا گھـر یـاد آتـا ہے اور مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا کرتــا ہے، جب اسے فتح و ظفر کی خـبر ملـتی ہے تـو نہ تـو اس کے ســامنے شــادیانے بجــائے جــاتے ہیں ، نہ جشــن شــاہانہ کی تیاریــاں کی جــاتی ہیں ، نہ عیش و طرب کے گانے گائے جاتے ہیں ۔ وہ صرف اپنے خــدا

کہ آگے سر بہ سجود ہوجاتا ہے اور سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ اسے جب مشیت ایزدی سے شکست ہوتی ہے تو وہ فوج کو بالکل جوش و غیرت نہیں دلاتا، بلکہ خدا ہی کی غیرت کی سلسلہ جنبائی کرتا ہے کیونکہ وُہ اپنی فوج کو خدا کی فوج یقین کرتا ہے:

کان یقول یوم احد: اللّٰھمّ انّک ان تشاءلا تعبد فی الارض۔

” آپ معرکہ احد کے دن کہتے تھے: خدایا کیا تو چاہتا ہے کہ اب زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو؟“

میدانِ جنگ میں خدا سے التجا

وہ اپنی فوج کی قلت اور دشمن کے لشکر کی کثرت دیکھتا ہے تو صرف رحمت آسمانی ہی سے مدد طلب کرتا ہے اور کسی دنیوی طاقت کے آگے دستِ سوال نہیں پھیلاتا:

لماکان یوم بدر نظر رسول اللّٰہ ﷺ الی المشرکین وھم الف و اصحابہ ثلاثمائۃ وتسعۃ عشر رجلا، فاستقبل القبلۃ ثمّ مدّیدیہ فجعل یھتف بربہ، اللھم انجزلی ماوعدتنی، اللھم اٰت ماوعدتنی اللّٰھمّ ان تھلک ھٰذہ العصابة من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض۔ فما زال یھتف بربّہ مادًا یدیہ مستقبل القبلةحتی سقط رداءہ عن منکبیہ فاتاہ ابوبکر فاخذ رداءہ فالقاہ علی منکبیہ، ثم التزمہ من ورائہ وقال یا نبی اللّٰہ! کفاک منا شدتک ربّک فانہٗ سینجزلک ما وعدک۔(مسلم)

”بدر کے دن جب آنحضرت ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا اور آپ ﷺ کو نظر آیا کہ ان کی جمعیت ایک ہزار کی ہے اور مسلمان صرف تین سو انیس ہیں تو آپ ﷺ قبلہ کی طرف متوجہ ہوگئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا کو پکارنا شروع کیا: خدا یا تونے مجھ سے فتح و ظفر کا جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر! خدایا اگر مسلمانوں کایہ مختصر سا گروہ فنا ہوگیا تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا وہ اسی طرح ہاتھ پھیلا کر متصل پکارتے رہے، یہاں تک کہ جوش استغراق میں دوش مبارک سے چادر گرگئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے اس تضرع والحاح کو دیکھا تو پاس آئے اور چادر اٹھاکرآپ ﷺ کے کاندھے پر ڈال دی۔ پھر پیچھے سے آکر آپ ﷺ سے لپٹ گئے اور کہا: “یا رسول اللہ! آپ ﷺ اپنی مناجات ختم کیجیے، خدانے آپ ﷺ سے جو وعدہ کیا ہے اسے بہت جلد پورا کرے گا”۔

میدان جنگ میں زخم

میدان جنگ میں اسے شدید زخم لگتا ہے، تو اس حالت میں صرف یہ کہہ کر خاموش ہوجاتا ہے:

رب اغفرلقومی فانہم لا یعلمون۔ (مسلم)

”خدایا! میری قوم کو معاف فرما، کیونکہ وہ لوگ حق کو نہیں جانتے۔ “

لیکن جب کبھی اس کے ہاتھ سے جہاد کا اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے تو وہ ازفرق تا بقدم

غضب و قہر الٰہی کا پیکر جلال و جبروت بن جاتا ہے:

ملاءالله قبورهم نارا قد شغلونا عن الصلوٰة الوسطی۔

”خدا کفار کی قبروں کو آگ سے بھر دے کیونکہ انھوں نے ہماری نماز عصر قضا کرادی۔“

بادشاہ اور پیغمبر کا فرق

قصہ مختصر، ایک فاتح میدان جنگ میں “سر پر غرور” مگر ایک پیغمبر “جبین نیاز” ہوتا ہے ، ایک بادشاہ میدان جنگ میں “زبان خودستا” ، مگر ایک داعی حق “زبان شکر سنج” ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں “غیظ و غضب” کا آتش کدہ مگر ایک مناد توحید “رحم و کرم کا سرچشمہ” ہوتا ہے۔ ان دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہے۔ بادشاہوں کے سر پرغرور بار ہا ٹھکرا دیے گئے،لیکن کسی موید من اللہ کی جبین نیاز خاک مذلت سے آلودہ نہ ہوئی۔ بادشاہوں کی زبان خود ستا بارہا ذلت کے ساتھ خاموش کر دی گئی، لیکن کسی داعی الٰہی کا نغمۂ حمدو شکر کبھی چپ نہ ہوا۔ بادشاہوں کے غیظ و غضب کے شعلے بار ہا بجھا دیے گئے ہیں مگر کسی پیغمبر کے دریائے کرم کو دنیا کے خس و خاشاک نہ روک سکے:

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۱۷۱
اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۱۷۲ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ
الْغٰلِبُوْنَ ۱۷۳ ⁰ (الصّٰفّٰت:۱۷۱۔۱۷۳)

مساوات

مساوات قانونی کو چھوڑ کر عام طرز مساوات پر غورکرنا چاہیے۔ آنحضرت ﷺتمام مسلمانوں کے آقا و سردار تھے، تاہم آپ ﷺ نے عام مسلمانوں سے اپنے لیے کبھی کوئی امتیاز نہ چاہا۔ایک سفر میں کھانا پکانے کے لیے صحابہ نے کام تقسیم کرلیے تو جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت سرور کائنات ﷺ نے خود اپنے ذمے لے لی۔

حضرت انس ﷺعنہ دس برس خدمت نبوی میں رہے۔ لیکن ان کا بیان ہے کہ اس مدت میں جتنی خدمت آپ ﷺ کی میں نے کی‘ اس سے زیادہ آپ ﷺ نے میری کی۔مساوات کا یہ عالم تھاکہ”ماقال لی فی شيءٍ لما فعلت” یعنی تحکمانہ کام لینا یا جھڑ کی دینا تو بڑی بات ہے، کبھی آپ ﷺ نے اتنا بھی نہ فرمایا کہ فلاں کام یوں سے یوں کیوں کیا؟

غلام اور آقا

ایک صحابی نے اپنے غلام کو مارا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے بھائی ہیں ، جنہیں خدا نے

⁰ اور ہمارا حکم ہمارے بندوں کے حق میں پہلے سے ہو چکا ہے جو رسول ہیں کہ بیشک انهی کو مددی جائے گی۔ بے شک ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ جو خود کھاؤ،وہ
انہیں کھلاؤ،جو خود پہنو،وہ انہیں پہناؤ۔

اسلام نے نہایت شدت کے ساتھ اس سے روکا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو،خواہ وہ کیسا ہی ادنیٰ درجے کا کیوں نہ سمجھا جاتا ہو، "غلام" اور "باندی" کہے۔کیونکہ سب خدا ہی کے غلام ہیں ۔ اسی لیے غلاموں کو فرمایا: "اپنے مربیوں کو " آقا" نہ کہیں کیونکہ اس سے مساوات اسلامی میں فرق آتا ہے۔"

ایک بار ایک صحابی نے آنحضرتﷺ کو ان الفاظ میں خطاب کیا: "اے آقائے من" آپﷺ نے فرمایا: مجھے آقا نہ کہو، آقا تو ایک ہی ہے یعنی خدا۔

ایک یگانہ مثال

قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری میں ماخوذ ہوئی۔ قریش نے رسول اللہﷺ سے سفارش کرنے کے لیے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو آمادہ کیا،جنہیں آپﷺ بہت عزیز رکھتے تھے۔لیکن جب اس واقعہ کے متعلق اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپﷺ سے سفارش کی تو آپﷺ نے لوگوں کو جمع کرکے فرمایا:

انما اهلک الذین قبلکم انهم کا نوا اذا سرق فیهم الشریف ترکوہ و اذا سرق فیهم الضعیف اقاموا علیہ الحدود، ایم اللّٰہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدها۔(بخاری،الشفا عتہ الحدود)

”لوگو! تم سے پہلی قومیں اس لیے ہلاک کی گئیں کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑدیتے پر جب کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اسے سزا دیتے لیکن خدا کی قسم! اگر محمدہ کی بیٹی فاطمہ ضللہعنہا بھی چوری کرتی تو اس کے ہاتھ ضرور کاٹے جاتے ۔ “

چوری کا ذکر صرف خصوصیت واقعہ کی بنا پر ہے ورنہ اس سے مرادعام جرائم ہیں ۔

پیغمبر اسلام کی دعوت

عالمگیر دعوت

پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کسی خاص قوم اور ملک کے لیے نہیں تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷[1] جوامع آیات میں سے ہے، جس نے دعوت اسلام کی پوری حقیقت واضح کردی:

۱۔ یہ دعوت یکساں طور پر تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔

۲۔ یہ ایک خدا کے آگے سب کے سروں کو جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔

---

[1] سورة اعراف کی آیت ۱۵۷ ہے۔
قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

(اے پیغمبر)کہو اے افراد نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں ، وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے ، کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں پر) ایمان رکھتا ہے، اس کی پیروی کرو تاکہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔

۳۔ ایمان باللہ وکلمات اس کا شعار ہے، یعنی خدا پر اور اس کے تمام کلمات وحی پر ایمان۔

فرمایا: خدا نے مجھے تم سب کی طرف بھیجا ہے وہ خدا کہ آسمان و زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے یعنی جب تمام کائنات ہستی میں ایک ہی خدا کی فرما نروائی ہے تو ضروری ہوا کہ اس کا پیغام ہدایت بھی ایک ہی ہو اور سب کے لیے ہو۔

پیام زندگی

پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت اس لیے ہے کہ تمہیں زندہ کردے❷ یعنی وہ انسانیت اعلیٰ کے انبعاث و قیام کی دعوت ہے۔ غور کرو اس دعوت نے وقت کی تمام مردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کردیا تھا۔ اس سے بڑھ کر مردوں کو جلانا کیا ہوگا؟ عرب کے ساربانوں میں ابوبکر، عمر ، علی، عائشہ، خالد، ابن ابی وقاص، ابن العاص (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر پیدا ہوگئے اور پچاس برس کے اندر عرب کے وحشی، کرۂ ارضی

---

❷ اشارہ ہے سورۃ انفال کی آیت: ۲۳ کی طرف یعنی
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ
مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمہیں (روحانی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کردے۔

کی سب سے بڑی اور مہذب قوم تھے۔

توحید

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ، وہ مالک الملک ہے، حی و قیوم ہے۔ اس کی حکومت سے کوئی گوشہ باہر نہیں اس کے علم سے کوئی شے مخفی اور اوجھل نہیں ۔ وہ غفلت سے منزہ اور نسیان سے پاک ہے۔ جس ہستی کی ایسی صفتیں ہوں ، اس کے سامنے کسی کی سعی و سفارش کی کیا گنجائش ہے اور اس کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کون ہے جو دخل دینے کی جرأت کر سکتا ہو؟

بعض ضروری نکتے

قرآن مجید میں توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات بھی کمال پر پہنچادی گئی۔ انسان کے لیے دینی عقاید و اعمال کا جو تصور قائم کیا، اس کی بنیاد تمام تر رحمت و محبت پر رکھی۔

سورۂ فاتحہ میں ربو بیت و رحمت کی صفتوں کے بعد "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳" (جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا) کہہ کر صفت عدالت کا ذکر کیا اور تمام صفات جلال کو عدالت ہی کے تابع رکھا۔

۱۔ فطرت کائنات میں ربوبیت ورحمت کے ساتھ مجازات بھی ہیں ۔ انسان نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کرلیا۔ اس طرح خدا کی

صفات میں خوف و دہشت کا تصور پیدا ہوگیا، حالانکہ جن مظاہر کو قہر وغضب پر محمول کیا گیا، وہ عین مقتضائے رحمت ہیں ، تعمیر کی تحسین وتکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی تو میزان عدل قایم نہ رہتی اور نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

۲۔ صفات الٰہی میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں ، البتہ عدالت ضرور ہے اور صفات قہر یہ جس قدر بیان کی گئی ہیں دراصل اسی (عدالت ہی) کے مظاہر ہیں ۔

(توحید فی الصفات میں صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی تمام راہیں بھی بند کردیں)۔

(الف) عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے۔ اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔

(ب) صرف خدا ہی کی ذات انسانوں کی پکار سنتی اور دعائیں قبول کرتی ہے۔ اگرتم نے دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کرلیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کرلیا ۔

(ج) اسی طرح عظمتوں ، کبریائیوں ، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا

کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص رہنا چاہیے۔ اگرتم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے پیدا کرلیا تو توحید کا اعتقاد درہم برہم ہوگیا۔

(د) یہی وجہ ہے کہ سورة فاتحہ میں “اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝۴ ” میں اول عبادت کے ساتھ استعانت کا ذکر بھی کیا گیا۔ پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا، جو مفید حصر ہے یعنی “صرف تیری ہی عبات کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں ۔“

(ہ) سب سے زیادہ اہم مسئلہ شخص نبوت کی حد بندی کا تھا۔ پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا اور اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ یہ قرار دیا، اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہٗ۔ “یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (ص) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں ”۔ اس میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے (اور بندگی کا اقرار رسالت کے اقرار پر مقدم ہے)۔

نبوت کی روشن ترین دلیل

سورۂ یونس میں ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦﴾

(آیت: ۱۶)

”تم کہو، اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اورتمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں ،کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں ؟“

صداقت نبوت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ، جس کے فضائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تمہیں میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں یعنی چالیس سال کی مدت تک یہ عمر انسان کی پختگی کی خاص مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور امانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہوسکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے تیار ہوجاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پاسکتے؟

تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق و فضائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے، جو سانچا اس عرصے میں بن گیا، وہ بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا پھر فرمایا:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰہِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِہٖ ۭ اِنَّہٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿١٧﴾ (یونس: ١٧)

"بتلاؤ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے، جو اپنے جی سے جھوٹ بنا کر اللہ پر افترا کرے اور اس آدمی سے جو اللہ کی سچی آیتیں جھٹلائے؟ یقینا جرم کرنے والے کبھی کامیابی حاصل نہیں کرسکتے"۔

دو باتوں سے تم انکار نہیں کرسکتے جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں ، جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر ہے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا۔ اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہوگیا ۔ جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا، اس کا کلمۂ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت

پیغمبر اسلام کی صداقت کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے سخت سے سخت معاند بھی اس عجیب و غریب کشش و تاثیر سے انکار نہیں کرسکتے تھے، جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی، چونکہ اعتراف حقیقت کے لیے تیار نہ تھے اس لیے مجبور ہوجاتے تھے اسے جادو سے تعبیر کریں ۔

”الانبیا“ کی آیت[❶] میں فرمایا: وہ پیغمبر اسلام کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ان کے پاس گئے اور جادو میں پھنسے، یہ ہماری طرح ایک آدمی ہے، پس جو کچھ اس کا اثر و نفوذ ہے، وہ جادو ہی کی وجہ سے ہے۔

سچائی کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اسے سچائی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر اور کچھ کہنا چاہو گے تو کتنا ہی زور لگاؤ، بات بنے گی نہیں ، بنے گی اسی وقت جب سر جھکادو گے کہ ہاں یہ سچائی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نفس انسانی کی گمراہی و سرکشی پر حقیقت کا اعتراف ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ وہ بغیر لڑے کبھی ہتھیار نہیں رکھے گی۔ وہ مانے گی (کیونکہ سچائی

---

❶ سورۃ انبیاءکی آیت ۳یہ ہے:
لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۗ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۖ اَفَتَاْتُونَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ﴿۳﴾ ”دل ہیں کہ یک قلم غافل اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے سرگوشیاں کیں ۔ یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جادو کے سوا اور کچھ نہیں ؟“

منوائے بغیر رہ نہیں سکتی) مگر اس وقت جب ماننے پر مجبور ہوجائے۔

پیغمبر اسلام نے جب کلام حق کی منادی شروع کی تو قریش مکہ کا یہ حال ہوا، وہ سچائی دیکھ رہے تھے، مگر اسے سچائی سمجھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔کبھی کہتے یہ مجنون ہوگیا ہے، خواب و خیال کو وحی و نبوت سمجھتا ہے۔ پھر تاثیر نفوذ دیکھتے تو کہتے جادوگر ہے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور یہ ساری باتیں آپس میں کہیں ۔ (ابن ہشام(

دین میں جبر نہیں

اس اصل عظیم کا اعلان کہ دین و اعتقاد کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر و استکراہ جائز نہیں ۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ جبر و استکراہ سے۔

قریش مکہ کا فتنہ کیا تھا؟ یہ کہ ظلم و تشدد سے دین و اعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا، پس جس بات کے خلاف اس نے جنگ کا حکم دیا خود اسی بات کا منکر کیونکر ہوسکتا ہے۔

دعوت کی راہ تلقین و ہدایت کی راہ ہے، جدل و خصومت کی راہ نہیں ۔ داعی حق کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسادے یا کسی خاص دلیل پر اڑ کر

اس کا ناطقہ بند کر دے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے دل میں سچائی اتاردے۔

خدا پرستی اور نیک عملی

خدا پر، خدا کے فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر، خدا کے تمام رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنا سچا اور کامل ایمان ہے۔ خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور آخرت دین کے بنیادی حقائق ہیں ۔

"خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں روزی دیتے ہیں ، انہیں بھی دیں گے۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں ۔ کسی جان کو قتل نہ کرو جسے خدا نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ یتیموں کے مال کی طرف نہ بڑھو۔ جب کبھی کوئی بات کہو، انصاف کی کہو، اگر چہ معاملہ اپنے قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے، اسے پورا کرو۔

خدا پرستی اور نیک عملی کی یہی راہ میری(خدا کی) ٹھہرائی ہوئی سیدھی راہ ہے، اسی پر چلو، اور راہوں پر نہ چلو کہ خدا کی راہ سے بھٹکا کر تمہیں تتر بتر کردیں ۔ جو کوئی اللہ کے حضور نیکی لائے گا تو اس کے لیے اس عمل نیک سے دس گنا زیادہ ثواب ہوگا اور جو

کوئی برائی لائے گا تو اس کے بدلے ہی سزا پائے گا۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستے دکھادیا ہے، وہی درست اور صحیح دین ہے ، ابراہیم ؑ کا طریقے کے ایک خدا کے لیے ہوجانا میری نماز ، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا صرف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار (یعنی مسلم) ہوں ۔”
(القرآن)

اوامرونواہی

۱۔ توحید فی العبادت کی تلقین، کیونکہ نفس توحید کا اعتقاد تو تمام پیروان مذاہب میں موجود تھا، لیکن توحید فی العبادت کی حقیقت مفقود ہوگئی تھی۔

۲۔ پھر والدین کے حقوق پر توجہ دلائی گئی۔ انسان کے لیے والدین کی ربوبیت، ربوبیت الٰہی کا پر تو ہے۔ والدین کی خدمت و اطاعت کی آزمائش کا اصلی وقت ان کے بڑھاپے میں آتا ہے، جب کمزوریاں انہیں دوسروں کی خدمت کا محتاج بنا دیتی ہیں ۔

انسان کی احتیاج کے دو ہی وقت ہیں : طفولیت اور بڑھاپا۔ طفولیت میں ماں باپ نے خدمت کی تھی، بڑھاپے میں اولاد کو خدمت کرنی چاہیے۔

۳۔ ماں باپ کے بعد ان سب قرابت داروں کے

حقوق ہیں ، جو ہماری خبر گیریوں کے محتاج ہوں ، ساتھ ہی "تبذیر" یعنی بے محل خرچ کرنے سے روکا۔ فرمایا: مال و دولت بے محل خرچ نہ کرو، خرچ کرنے کا صحیح محل ارباب حقوق ہیں ۔

۴۔ مال و دولت خرچ کرنے میں اور ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو، کسی ایک طرف نہ جھک پڑو کہ خرچ کرنے پر آئے تو سب کچھ اڑا دیا۔ احتیاط کرنی چاہی تو کنجوسی پر اتر آئے۔

۵۔ اولاد کو افلاس کے ڈر سے ہلاک نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

۶۔ زنا سے دور رہو، یہ بڑی بے حیائی کی بات اور بڑی برائی کا چلن ہے۔

۷۔ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو۔جسے قتل نہ کرنا اللہ نے حرام ٹھہرادیا ہے، ہم نے مقتول کے وارث (یا وارثوں) کو مطالبۂ قصاص کا اختیار دے دیا ہے۔ پس چاہیے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کی جائے۔

۸۔ یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ (یعنی اسے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو) مگر ایسے طریقہ پر جو ان کے لیے بہتر ہو، جب یتیم جوان ہوجائیں تو امانت ان کے حوالے کردو۔

۹۔ عہد پورا کرو، اس کے بارے میں تم سے باز پرس کی جائے گی۔

۱۰۔ جب کوئی چیز ماپو تو پیمانہ بھر پور رکھا کرو، تو لو تو صحیح ترازو سے (یعنی نہ

ماپ میں کمی کرو اور نہ تول میں ڈنڈی مارو)۔

فرمانبرداروں کے نشان

ان لوگوں کے اعمال و اوصاف (کی مجمل سی کیفیت) جنہوں نے احکام حق قبول کیے اور دنیا کے لیے نافع بن گئے۔

الف۔ اللہ کی بندگی کا عہد پورا کرتے ہیں اور اپنی عبودیت میں سچے اور کامل ہیں ۔

ب۔ اللہ نے جو رشتے جوڑ دیے، انہیں ظلم و نا انصافی سے توڑتے نہیں بلکہ رشتے کا پاس کرتے اور ہر علاقے کا حق ادا کرتے ہیں ۔ اس عمل میں تمام حقوق العباد آگئے جس طرح الف میں حقوق اللہ آگئے۔

ج۔ آخرت کی فکر سے بے پروا نہیں ہوتے۔ جو کچھ کرتے ہیں ، اس میں خوف آخرت کی کھٹک موجود ہوتی ہے۔ یقین رکھتے ہیں کہ ایک روز کسی کے آگے پیش ہونا ہے۔ اور حساب کی سختی سے بچنا ممکن نہیں ۔

د۔ اللہ کی محبت میں ہر طرح کی ناخوشگوار حالتیں صبر و ثبات کے ساتھ جھیل لیتے ہیں ، شدتوں اور محنتوں سے منہ نہیں موڑ تے، آزمائشوں کو پیٹھ نہیں دکھاتے۔

ہ۔ نماز اس کی ساری شرطوں کے ساتھ قائم کرتے ہیں ۔

و۔ جو کچھ کماتے ہیں ، اسے صرف اپنے ہی نفس پر خرچ نہیں کرتے، دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں

اور ہر حال میں خرچ کرتے ہیں ، کھلے طورپر بھی اور پوشیدہ طور پر بھی۔
ز۔ بدی کا بدلہ بدی کرنا ان کا شیوہ نہیں ۔ کوئی ان کے ساتھ کتنی ہی برائی کرے، وہ بھلائی ہی سے پیش آئیں گے۔

ایمان والوں کے پانچ وصف

مومنوں کے پانچ وصف خصوصیت سے بیان کیے گئے۔ گویا قرآن کے نزدیک ایمان وعمل کے مرقع میں سب سے زیادہ نمایاں خط و خال یہی ہیں ۔ جس زندگی میں یہ خصائص نہ ہوں وہ مومن کی زندگی نہیں ہوسکتی۔

الف۔نماز کی محافظت اور اس کا خضوع و خشوع سے ادا کرنا۔ کسی باہیبت وجلال مقام پر کھڑے ہوجاؤ، تمہارے ذہن و جسم پر کیسی حالت طاری ہوجائے گی؟ ایسی ہی حالت کو عربی میں “خشوع” کہتے ہیں ۔

ب۔ ہر اس بات سے مجتنب رہنا جونکمی ہو، صرف انہی باتوں کا اشتغال رکھنا جو دین و دنیا میں نافع ہوں۔

ج۔ کمائی میں سے اپنے محتاج بھائیوں کے لیے خرچ کرنا۔

د۔ زنا سے کبھی آلودہ نہ ہونا۔

ہ۔ امانت دار ہونا اور اپنے عہدوں کو پورا کرنا۔

راہ حق کے پیشرو

راہ حق میں سب سے آگے نکل جانے والے وہ ہیں :

الف۔ جو اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں ۔

ب۔ جو پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

ج۔ جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں ، بلا تامل دے دیتے ہیں ۔ ان کے دل ترسان رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور انہیں لوٹنا ہے ۔

طریق خیر و سعادت

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ قرابت داروں کے حقوق سے غافل نہ ہو۔ یتیموں ، مسکینوں ، مسافروں اور پڑوسیوں کی خبر گیری کرتے رہو۔ پڑوسی خواہ قرابت دار ہو، خواہ اجنبی ، ہرحال میں اچھے برتاؤ کا مستحق ہے ۔ اسی طرح جو لوگ تمہارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ہوں لونڈی غلام جو تمہارے قبضے میں ہیں ، ان سب کے بھی تم پر حقوق ہیں ۔ ضروری ہے کہ سب کے ساتھ محبت اور احسان سے پیش آؤ۔

بخل نہ کرو، خدا نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے بندوں کی خدمت میں خرچ کرو۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا ہاتھ انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) سے کبھی رک نہیں سکتا۔ البتہ جو کچھ خرچ کرو اللہ

کے لیے کرو، نام و نمود کے لیے نہ کرو۔

نظم و فلاح میں اصل اصول

اجتماعی زندگی میں نظم و فلاح کے لیے اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حقدار ہو، اس کے حق کا اعتراف کرو اور جو چیز جسے ملنی چاہیے، وہ اس کے حوالے کردو۔ وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو، قرضدار کا قرض ہو، امانت رکھنے والے کی امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدے ہوں جو جس کا اہل ہو، اسے ملنا چاہیے۔

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو صرف عدل و انصاف پیش نظر ہو، کسی حالت اور کسی صورت میں بھی یہ جائز نہیں کہ فیصلہ انصاف کے خلاف کیا جائے۔

مسلمانوں کے لیے اصل دین

مسلمانوں کے لیے اصل دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں ، اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور جو لوگ ان میں سے صاحب حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں (بشرطیکہ اصحاب حکم و اختیار کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش نہ ہو جو اللہ اور رسول کی اطاعت کے خلاف ہو)بہ صورت نزاع اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی طرف رجوع کیا جائے اور جو فیصلہ ملے، اس کے آگے سب سر تسلیم خم کردیں ۔

قوامون با لقسط

مسلمانوں کو چاہیے کہ “قوامون بالقسط”

ہوں یعنی حق و راستی پر اس مضبوطی سے قائم رہنے (اور جم جانے والے) کہ کوئی بات بھی انہیں جگہ سے ہلا نہ سکے۔چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں ۔ دنیا کی کوئی چیز انہیں سچ کہنے سے روک نہ سکے۔ اگر کسی معاملے میں سچائی خود ان کی ذات کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور اعزہ واقربا کے خلاف ہو، جب بھی انہیں سچی ہی بات کہنی چاہیے، وہ صرف سچائی ہی کے لیے دل و زبان رکھتے ہیں ۔[1]

بنیادی دستور العمل

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے شعائر کی بے حرمتی روانہ رکھیں ۔ دوسروں کے معاملے میں ان کا دستور العمل یہ ہونا چاہیے کہ نیکی کے کاموں میں سب کی مدد کریں ۔ کوئی ظلم کرے تو یہ برائی ہے، اس سے بچیں ۔ کوئی حج و زیارت کو جائے تو یہ بھلائی ہے اس کے معاون بنیں (گویا نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں تعاون، گناہ اور ظلم کی ہر بات میں

---

[1] سورۂ مائدہ ۸میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ:
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۸ ”ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لیے ابھاردے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو ۔ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے“۔

لاتعاون ہر مسلمان کے لیے بنیادی اصل کار ہے)۔
دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام چاہتا ہے کہ ہم اپنی سیرت میں سرتا سرحق و صداقت کے پیکر بن جائیں ۔

انسانی مساوات

نسل انسانی کی مساوات کا اعلان اور نسل و شرف کے تمام امتیازات سے انکار جو لوگوں نے بنا رکھے تھے اور جن کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے۔ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بڑا ہو یا چھوٹا، وضیع ہو یا شریف، انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں ۔

رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں قریش کو خطاب کرتے ہوئے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار فرمادی تھی۔ فرمایا:

”اے جماعت قریش ! خدا نے تمہاری جاہلانہ نخوت اور آبا واجداد پر اترانے کا غرور آج توڑدیا (سچ تو یہ ہے) سب لوگ آدم کے فرزند ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا تھا۔ خدا فرماتا ہے: ”لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ گوکہ قبیلے سب پہچان کے لیے بنادیے ہیں اور خدا کے ہاں تو اس کی زیادہ عزت، جس میں تقویٰ زیادہ ہے“[۵]

جب تمام انسان ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا)

---

[۵] متین جلد اول ص ۱۵۶۔ جس آیت کا ترجمہ دیا گیا ہے وہ سورۃ حُجرات کی تیرھویں آیت ہے یعنی: یٰاَیُّہَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

کی اولاد ہیں تو انسان ہونے میں امتیازات کی کون سی وجہ ہے۔ پھر خدا کے ہاں عزت کا جو معیار قرار پایا یعنی تقویٰ ، وہ ایسا ہے کہ اس میں انسانوں کے درمیان حسد ورقابت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ منافی تقویٰ ہوگی۔ باقی ہر معیار یعنی دولت، عہدہ ، رنگ وغیرہ میں حسد و رقابت کے سوا اور کسی بات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔“

دین کی اصل عظیم

دین کی اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ اصل شے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے۔ شریعت کے ظاہری احکام و رسوم بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔

نزول قرآن کے وقت دنیا کی ایک عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے، دین سے مقصود محض شریعت کے ظواہر ورسوم ہیں اور انہیں کے کرنے ،نہ کرنے پر نجات و سعادت موقوف ہے۔ پس جہاں تک دین کا تعلق ہے ،ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے،نہ کہ وسائل کی۔

ابراہیم علیسلم کی راہ

دین کی جو راہ حضرت ابراہیم علیسلم نے اختیار کی تھی، وہ کیا تھی؟ ان کے بعد ان کی

اولاد جس طریقہ پر چلتی رہی، وہ کون سا طریقہ تھا؟ خود حضرت یعقوب علیسلم نے بسترمرگ پر جس دین کی وصیت کی تھی وہ کونسا دین تھا؟ وہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی نہ تھی(اس وقت تک یہودیت اور مسیحیت کا تو وجود بھی نہ تھا) وہ صرف خدا پر ایمان لانے اور اس کے قانون سعادت کی فرمانبرداری کرنے کی فطری اور عالمگیر سچائی تھی۔ اسی کی دعوت قرآن نے دی۔

دین الٰہی کو "الاسلام" کے نام سے تعبیر کیا گیا، جس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں یعنی ہر طرح کی نسبتوں اور گر وہ بندیوں سے الگ ہو کر صرف اطاعت حق کی طرف انسانوں کو دعوت دی جائے۔[1]

عمل کی کمائی

قانون الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد کو وہی پیش آتا ہے جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے اور نہ ایک کی بد عملی کے لیے دوسرا جواب دہ ہوسکتا ہے۔

انسان کے لیے قدامت پسندی کا پھندا بڑا ہی

---

[1] ملاحظہ فرمائیے اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (بلاشبہ اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے) (آل عمران ۔ ۱۹) وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ (جو کوئی اسلام کے سوا دوسرے دین کا خواہش مند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا)(آل عمران ۔۸۵) وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا (تمہارے لیے پسند کیا دین اسلام کو) (مائدہ ۔ ۳)

سخت ہے،اس کے بیچ سے وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا۔ ہندو ہزاروں برس سے مہا بھارت اور پرانوں کے افسانوں میں پھنسے ہوئے ہیں ۔ مسلمانوں کے دو فرقے آج تک اس نزاع سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیرہ سو برس پہلے سقیفہ(بنوساعدہ) میں خلافت کا جو انتخاب ہو اتھا وہ صحیح تھا یا غلط؟ قرآن کہتا ہے، "تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَہَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُم مَّا کَسَبْتُمْ"(البقرہ۔ ۱۳۴)اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔تم اپنی خبر لو۔ ان کے اعمال ان کے لیے تھے اور تمہارے،تمہارے لیے ہیں ۔

دنیا پرستی کا غرور

دین حق دنیا کا نہیں ، دنیا پرستی کے غرور و سرشاری کا مخالف ہے۔ یہی دنیا کا غرور انسان کو خدا پرستی اور راست بازی سے بے پر وا کردیتا ہے۔ جب اسے طاقت اور حکومت مل جاتی ہے تو غرض و نفس کی پر ستش میں وہ سب کچھ کرگزرتا ہے، جو دنیا میں انسان کا ظلم و فساد کر سکتا ہے۔ جو لوگ سچے خدا پر ست ہیں ،وہ دنیا میں کتنے ہی مشغول ہوں ، مگر ان کے پیش نظر نفس پرستی نہیں ، صرف رضا ۓ الٰہی ہوتی ہے۔

آخرت کی نجات

آخرت کی نجات کا دارومدار تمام ترایمان و

عمل پر ہے۔ وہاں نہ تو نجات کی خرید و فروخت ہوسکتی ہے نہ کسی کی دوستی اور آشنائی کام دے سکتی ہے، نہ کسی کی سفارش سے کام نکالا جاسکتا ہے۔ (کسی نیک اور بزرگ ہستی سے حسن عمل کاسبق لیا جا سکتا ہے۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ اہل علم سے مسائل پوچھے جا سکتے ہیں ، لیکن نجات کاانحصار اپنے ہی ایمان و عمل پر یا اللہ کی رحمت پر ہے۔ کسی کی سعی و سفارش کچھ اعانت نہیں کر سکتی۔ ایسا تصور ہی سراسر غیر اسلامی ہے۔)

حق و باطل کا معیار

حق و باطل کے معاملے میں انسانوں کی قلت و کثرت معیا ر نہیں ہے۔ گمراہی و حق فراموشی کے ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں کہ نوع انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہوجاتی ہے۔ ایسا ہی دور نزول قرآن کے وقت بھی دنیا پر چھایا ہو ا تھا۔ گمراہوں کی کثرت نہ دیکھو یہ دیکھو کہ کون سی راہ یقین اور بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل وگمان کی۔ حق کی راہ یقین و بصیرت ہی کی راہ ہے نہ کہ جہل و گمان کی۔ اگرچہ بہت تھوڑے آدمی اس راہ پر کاربند ہوں ۔ آج دنیا کی آبادی میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، نہ کہ مسلمانوں کی ۔ پھر کیا اس بنا پر اکثریت کے مطابق حق کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ ابتدائی دور میں مسلمان

بہ مشکل چند لاکھ ہوں گے لیکن انہوں نے حیرت انگیز سعی وہمت اور نادیدہ جوش فدا کاری سے چند سال کے اندر ر وئے زمین کے گوشے گوشے میں نور حق کا اجالا کر دیا۔ آج ان کی بھیڑ ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو باطل کی ظلمت کاریوں سے محفوظ رکھنے میں بہ بس نظر آتے ہیں اور وہ گر وہ در گروہ ایسے طور طریقے اختیار کیے بیٹھے ہیں، جنہیں حق نہیں ، باطل کے شاخسانے ہی کہا جا سکتا ہے۔

منکرین آخرت

جو لوگ منکرین آخرتہیں یعنی محاسبہ اعمال پر اعتقاد نہیں رکھتے، ان کی ذہنیت چار حال سے خالی نہیں :

اے انہیں خدا سے ملنے کی توقع نہیں ۔

بے وہ صرف دنیوی زندگی میں خوشنود ہوتے ہیں ۔

جے اس حالت کے خلاف ان کے اندر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی، اسی پر وہ مطمئن ہوگئے ہیں ۔

دے ان کے ذہن وادراک میں اس درجہ تعطل پیدا ہوگیا ہے کہ قدرت کی تمام نشانیاں جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ، انہیں بیدار نہیں کر سکتی۔

ان میں سے ہر بات نہ صرف بیان حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

مشکلیں اور آزمائشیں

کتاب و حکمت کی تعلیم،شخص نبوت کی پیغمبرانہ تربیت(تزکیہ)، مرکز ہدایت کا قیام (کعبہ مکرمہ) اور بہترین امت (خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔آل عمران۔ ۱۱۰)۔ ہونے کا نصب العین، یہی وہ بنیادی عناصر تھے جو موعودہ امت کی نشوونما کے لیے ضروری تھے۔ یہ تمام مراتب ظہور میں آگئے تو پیروان دعوت قرآنی کو سرگرم عمل ہوجانے کا حکم مل گیا۔ سرگرم عمل ہوجانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مشکلیں اور آزمایشیں پیش آتیں ، اس لیے صبر و استقامت اور جان فروشی کی بھی دعوت دی گئی۔

صبر و ثبات

فرمایا: “صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو”۔صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات و مصائب کو جھیلنے اور نفسیاتی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا کی جائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر و فکر سے روح کو تقویت ملتی ہے۔ جس جماعت میں یہ دو قوتیں (صبر اور نماز) پیدا ہوجائیں گی، وہ کبھی ناکام نہیں ہوسکتی۔

دوسرا جو جماعت موت سے ڈرتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی،راہِ حق میں موت، موت نہیں ، سرتا سر

زندگی ہے۔ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب ہیں اور کتنی بڑی جماعتیں ہیں جو چھوٹی جماعتوں سے شکست کھا جاتی ہیں ۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی قلت و کثرت پر نہیں ،دلوں کی قوت پر ہے۔ اللہ کی مدد انہیں لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جو صابر اور ثابت قدم ہوتے ہیں ۔

مسلمانوں کا نصب العین

مسلمانوں کا جماعتی نصب العین یہ نہیں قرار دیا گیا کہ وہ طاقتور قوم بنیں یا سب سے برتر گروہ ہوں کیونکہ طاقت و برتری میں جماعتی گھمنڈ اور قومی حرص و آزکا لگاؤ تھا اور یہ بات انسانیت کے امن و سلام اور مساوات و اخوت کے منافی تھی۔ پس صرف "خیر" اور "بہتر" ہونے پر زور دیا گیا۔ (کُنتُمْ خَیرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) جس کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے۔ جس جماعت کا نصب العین یہ ہوگا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو ، وہ طاقتوں کے غرور اور قومی نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہوسکتی۔ (اور حق یہ ہے کہ خیر و سعادت میں سب سے بڑھ کر ہونے کے بعد کسی جماعت کی معنوی قوت میں کون سی چیز کی کمی رہ سکتی ہے اور معنوی قوت سے بڑھ کر کون سی قوت ہے جو امن وسلام کی ضامن ہو؟)

وحدت دعوت

قرآن مجید نے دین حق کے اس اصل عظیم کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تمام نبی صرف ایک ہی دین کے داعی تھے۔ جب اللہ کا دین ایک ہے تو تمام رہنما ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں ۔ جو ان میں تفریق کرتا ہے، وہ پورے سلسلہ ہدایت ہی کا منکر ہے۔ اللہ کا دین اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانین فطرت کی اطاعت کی جائے اور آسمان و زمین میں جس قدر مخلوق ہے، سب قوانین الٰہی کی اطاعت کر رہی ہے۔ پھر اگر تمہیں اللہ کے قوانین فطرت سے انکار ہے تو اللہ کے قانون کے سوا کائنات ہستی میں اور کون سا قانون ہو سکتا ہے؟

ایمان اور محبت

اللہ پر ایمان اور اللہ کی محبت دونوں لازم ملزوم ہیں ۔ اگر کوئی اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی ویسی ہی چاہت سے ماننے لگے، جیسی چاہت سے ماننا صرف اللہ کے لیے ہے تو یہ اللہ کے ساتھ دوسرے کو ہم پلہ بنا دینا ہوا اور توحید الٰہی کا اعتقاد درہم برہم ہوگیا۔ مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھنے والا ہو۔(وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ۔البقرہ۔ ۱۶۵)

جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعویدار ہے اسے چاہیے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرے۔ اللہ

کی محبت کــا دعــویٰ اور اس کی راہِ بتلانے والے
کی پــیروی ســے انکــار ایــک دل میں جمــع نہیں
ہوسکتا۔

قرآن مجید کے چار وصف

سورۂ یونس میں ہے:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ (آیت: ۵۷)

”لوگو تمہارے پاس پروردگار کی جـانب سـے ایـک ایســی چــیز آگــئی ہے، جــو مــوعظت ہے،دل کی بیمــاریوں کے لــیے شــفا ہے اور ہدایت اور رحمت ہے، ان لوگــوں کے لــیے جــو اس پــر یقین رکھــتے ہیں ۔“

اس میں قرآن کے چار وصف بیان کیے:

۱۔ ” مَّوْعِظَةٌ“ ہے یعنی دل میں اتر جانے کی دلیلــوں اور روح کو متــاثر کــرنے والے طریقــوں ســے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے ، جـو خـیر و حـق کی باتیں ہیں ۔ ان تمــام بــاتوں ســے روکتــا ہے جو شر و بطلان کی باتیں ہیں ۔ کیونکہ عــربی میں وعظ کا مفہوم صــرف نصــیحت نہیں بلکہ ایسی نصیحت ہے جو موثر دلائل اور دل نشــیں دلیلوں سے کی جائے۔

ب۔ “شِــفَآءٌ لِّمَــا فِى الصُّــدُوْرِ”. دل کی تمــام بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے، جو فرد یا جو گــر وہ اس نســخہ پــر عمــل کــرے گــا، اس کے قلوب ہر طرح کے مفاسدور ذائل سے پــاک ہو

جائیں گے۔ یاد رہے کہ عربی میں قلب، فواد اور صدر کے الفاظ جب کبھی ایسے موقع پر بولے جائیں ، جیسا یہ موقع ہے تو ان سے مقصود انسان کی معنوی حالت ہوتی ہے۔ یعنی ذہن و فکر کی قوت،عقلی ادر اک، جذبات وعواطف،اخلاق و عادات ،اندرونی حسیات؛ وہ عضو مقصود نہیں ہوتا، جو فن تشریح کا دل اور سینہ ہے۔

ج۔ "ہُدًی" ہے یعنی یقین کرنے والوں کے لیے ایک ہدایت۔

د۔ "رَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ" یقین کرنے والوں کے لیے پیام رحمت ہے، یعنی ظلم و قساوت اور بغض و تنفر سے دنیا کو نجات دلاتا ہے۔ رحم و محبت اور امن و سلامتی کی روح سے معمور کرتا ہے۔

اعلان ہی نہیں دلیل بھی

یہ محض قرآن کے اوصاف کا مدعیا نہ اعلان ہی نہ تھا، بلکہ اس کی صداقت کی سب سے زیادہ موثر دلیل بھی تھا۔ اگر ایک شخص دعویٰ کرے کہ وہ طبیب ہے تو اس کے دعوے کی جانچ کا سب سے زیادہ سہل اور قطعی طریقہ یہ ہوگا کہ دیکھا جائے اس کے علاج سے بیماروں کو شفا ملتی ہے یا نہیں؟ قرآن نے بھی جا بجا یہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے۔ اس نے کہا، میں نسخہ شفا ہوں۔ ثبوت میں مومنوں اور متقیوں کی جماعت پیش کردی، جو اس کے دارالشفا میں

تیار ہوئی تھی۔ آج بھی اس کی دلیل اسی طرح قاطع ہے ،جس طرح عہد نزول میں تھی۔ اگر اس نے عرب جاہلیت کے مریضان روح و دل میں سے ابوبکر،عمر،علی،خالد،سلمان،ابوذر ضیللہعنہم وغیرہ جیسی تندرست روحیں پیدا کردی تھیں تو کیا اس کے نسخہ شفا میں شک کیا جاسکتا ہے؟

صراط مستقیم اور دین قیم

سورۃ بنی اسرائیل آیت ۹میں فرمایا:

اِنَّ ہٰذَا الْقُرْاٰنَ یَہْدِیْ لِلَّتِیْ ہِیَ اَقْوَمُ

"بلا شبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے۔"

قرآن نے اپنے جس قدراوصاف بیان کیے ہیں ،ان میں جامع ترین وصف یہی ہے کہ زندگی اور سعادت کے ہر گوشے میں اس کی رہنمائی سیدھی سے سیدھی بات کے لیے ہے۔ کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا پیچ وخم،کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط اس کی رہنمائی میں نہیں ہوسکتی۔ یہی حقیقت دوسری جگہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" اور "الدِّیْنُ الْقَیِّمُ" (التوبہ۳۵) سے تعبیر کی گئی ہے۔

دین حق کے تین بنیادی اصول

سورۂ اعراف آیت ۲۹ میں ہے:

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْہَکُمْ عِنْدَ کُلِّ

مَسْجِدٍ وَّادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ

"تم کہو! میرے پروردگار نے جو حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو، اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ درست رکھو اور دین کو اس کے لیے خالص کرکے اسے پکارو۔"

اس آیت میں دین حق کے تین بنیادی اصول واضح کر دیے:

۱۔عمل میں اعتدال ، ۲۔عبادت میں توجہ اور ۳۔ خدا پرستی میں اخلاص۔ یہ آیت باب توحید میں اصل اصول ہے۔دین کو خدا کے لیے خالص کر کے پکار و یعنی دین کی جتنی باتیں ہیں وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کردو۔"خلق" اور "امر" دونوں اللہ ہی کی ذات سے ہیں یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اور اسی کے حکم و قدرت سے اس کا انتظام ہو رہا ہے۔

دکھاوے کی خیرات

دکھاوے کی خیرات ا کارت جاتی ہے۔ جو شخص نیکی کے لیے نہیں ، نام و نمود کے لیے خیرات کرتا ہے اور خدا کی جگہ انسانوں میں بڑائی چاہتا ہے وہ یقینا خدا پر سچا ایمان نہیں رکھتا ۔ ایسی خیرات سے روکا گیا ہے ، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک چوری چھپے خیرات نہ کر سکو، خیرات کرو ہی نہیں یا پوشیدگی کا تعلق بجائے خود عمل خیر سے مانع ہوجائے(چھپائے رکھنا ممکن ہو تو نہ چھپانا رفتہ

رفتہ ریا و نمایش کا باعث بن سکتا ہے۔ نیت پاک ہو ا ور خدا کی رضا کے سوا کچھ منظور نہ ہو تو کسی کے سامنے بھی خیرات کر دینا نا مناسب نہیں بلکہ بعض اوقات کھلم کھلا خیرات دوسروں کے لیے وسیلہ ترغیب بن جاتی ہے۔ مقصود حقیقی یہ ہے کہ نمودو نمایش سے نیت کا آئینہ آلودہ نہ ہونے پائے)۔

نکمی اور بیکار چیزیں خیرات کے نام سے محتاجوں کو نہ دو، سوچو کہ اگر تمہیں کوئی ایسی چیز دے تو لینا پسند کرو گے؟

محبت و ہمدردی کے تقاضے

نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد نشو و نما نہیں پاسکتی تھی، اگر اس کا حکم دیتے ہوئے ایسی باتوں سے روک نہ دیا جاتا جو ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہیں ۔ پس انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) کے ساتھ ساتھ سُود کی بھی مما نعت کردی گئی۔

دین حق انسانوں میں محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے خیرات کا حکم دیا کہ ہر انسان دوسرے کی احتیاج، اپنی احتیاج سمجھے۔ سود خوار کی ذہنیت بالکل اس کی ضد ہے، وہ چاہتا ہے۔ دوسرے کی احتیاج سے خود انتہائی فائدہ اٹھائے اور محتاج کو دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنائے (گویا سود خور کے دل میں ہم جنسوں کے لیے محبت و ہمدردی کا کوئی احساس باقی ہی نہیں رہتا)

مومن اور امید ویقین

قرآن نے ہر جگہ حقیقت واضح کی کہ ایمان، امید اور یقین ہے، کفر ، شک اور مایوسی ہے ۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ مایوس نہ ہوں ، امید کا چراغ روشن رکھو، ہر حال میں امید وارفضل و سعادت رہو، یہی مقتضائے ایمان ہے، یہی سر چشمہ زندگی ہے۔ اسی سے تمام دنیوی اور اخروی کامرانیوں کی دولت حاصل ہوسکتی ہے۔

جس انسان نے امید و یقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی، خواہ دنیا کی زندگی کے لیے ہو، خواہ آخرت کے لیے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ۔ ایسے آدمی کے لیے صرف یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈالے اور زندگی ختم کردے۔

ایمان نام ہی امید کا ہے اور مومن وہ ہے جو مایوسی سے کبھی آشنا نہیں ہوسکتا ۔ اس کا ذہنی مزاج کسی چیز سے اتنا بیگانہ نہیں ، جس قدر مایوسی سے۔ زندگی کی مشکلیں اسے کتنا ہی ناکام کریں لیکن وہ پھر سعی کرے گا۔ لغزشوں اور گناہوں کا ہجوم اسے کتنا ہی گھیرے لیکن وہ پھر تو بہ کرے گا نہ تو دنیا کی کامیابی سے وہ مایوس ہوسکتا ہے، نہ آخرت کی نجات سے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی مایوسی موت ہے اور آخرت کی مایوسی شقاوت ۔ وہ دونوں جگہ رحمت الٰہی کو دیکھتا اور اس کی بخششوں پر

یقین رکھتا ہے کہ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝۵۳

(اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے۔ ہاں ، وہ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ (سورہ زمر: ۵۳)

قبول حق کی استعداد

بارش سے صرف وہی زمین فائدہ اٹھا سکتی ہے جس میں اس کی استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو سر سبز نہ ہوگی ۔ اسی طرح قرآن کی ہدایت سے بھی وہی روحیں شاداب ہوں گی جن میں قبولیت حق کی استعداد ہے۔ جنہوں نے استعداد کھودی، ان کے حصے میں محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آباءواجداد کی اندھی تقلید ، گھڑی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتدا میں جبل و فساد سے کوئی عقیدہ گھڑ لیا جاتا ہے، ایک مدت تک لوگ اسے ما نتے رہتے ہیں ۔ جب ایک عرصے کے اعتقاد سے اس میں شان تقدیس پیدا ہوجاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور عقل و بصیرت کی کوئی بھی دلیل اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن اسی کو " اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ" (نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آبا و اجداد نے گھڑ لیے ہیں) سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ بنائے ہوئے ناموں کے سوا وہ کوئی حقیقت اور معقولیت پیش نہیں کرسکتے۔

پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں

سورۂ اعراف کی آیت[1] میں پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں بیان کیں :

۱۔ نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے۔

۲۔ پسندیدہ چیزوں کا استعمال جائز ٹھہراتا ہے، ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال کو روکتا ہے، قرآن نے اس معنی میں "طیبات" اور "خبائث" کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۳۔ جو بوجھ اہل کتاب پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں وہ گرفتار ہوگئے تھے، ان سے نجات دلاتا ہے۔

یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کیا تھے، جن سے قرآن نے نجات دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کردیا ہے: مذہبی احکام کی بیجا سختیاں ، مذہبی زندگی کی ناقابل عمل پابندیاں ، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں ، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں ۔ پیغمبر اسلام

---

[1] اس آیت ۱۵۷ کا متعلقہ حصہ یہ ہے:
يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (پیغمبر اسلام، جس کی شفاعت تورات و انجیل میں یوں مکتوب تھیں کہ) وہ نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھرائے گا اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس تلے وہ دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔

کی دعوت نے ان سب سے نجات دلادی۔ سچائی کی ایسی سہل و آسان راہ دکھادی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ اور عمل کے لیے کوئی سختی نہیں ۔

درخشاں حقائق

چند حقائق ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ قرآن کے نزدیک کسی جماعت کے مسلمان ہونے کی عملی شناخت دو باتیں ہیں : نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کا نظام، جو جماعت یہ دو عمل ترک کردے گی (وہ عملاً) مسلمان متصور نہ ہوگی۔ زکوٰۃ کے نظام سے مراد یہ ہے کہ حکومت یہ انتظام نہ کرسکے یا کسی جگہ مسلمان خدا نخواستہ محکوم ہوجائیں تو وہ خود زکواۃ کا نظام سنبھالیں ۔

اس آیت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

۲۔ شرف و بزرگی کے رسمی مناصب کوئی چیز نہیں ،بزرگی اسی کے لیے ہے جو عمل و ایمان کی بزرگی رکھتا ہے۔

۳۔ قرآن کے نزدیک سب سے بڑا درجہ ان انسانوں کا ہے جو ایمان و حق پرستی کی راہ میں قربانیاں کرنے والے ہیں ، نہ کہ ان لوگوں کا جو رواجی نیکیوں اور رسمی نمائشوں میں سرگرم نظرآتے ہیں۔

۴۔ مومن وہ ہے جس کی حب ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت غالب نہ آسکے ۔

۵۔ جماعت کی زندگی اور فتح و کامرانی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں کہ مذبذب

اور ورد لے آدمی اس میں موجود ہوں ۔

۶۔ کاروبار حق میں دارومدار شخصیتوں پر نہیں ۔ شخصیت اس لیے ہے کہ بیج بودے ۔ باقی رہے برگ و بار، تو ہوسکتا ہے کہ اس کی زندگی ہی میں سب نمودار ہوجائیں ۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ زندگی میں ،کچھ اس کے بعد ہوں ۔ اس تاخیر سے کاروبار حق پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔

۷۔ حلت و حرمت اشیاءمیں قرآن کے اصول اربعہ:

الف۔ اصل اباحت ہے نہ کہ حرمت ، الا یہ کہ وحی الٰہی نے کسی چیز کو حرام ٹھہرادیا ہو۔

ب۔کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینے کا حق خدا کی شریعت کو ہے۔

ج۔ محض اپنی رائے اور قیاس سے کوئی چیز حرام ٹھہرانا افترا علی اللہ یعنی خدا پر بہتان باندھنا ہے۔

د۔ انسان کے عقائد و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے ، نہ کہ وہم و گمان پر۔

تذکیر و توکیل

پیغمبر کا کام “تذکیر”و “تبلیغ” ہے “تبشیر” و “تنذیر” ہے۔ وہ داعی اور مذکر ہے۔ “وکیل” یعنی نگہبان نہیں جو زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جائے، پھر اس سے نکلنے نہ دے۔ سورہ

یونس میں ہے: وَمَا اَنَا عَلَیْکُمْ بِوَکِیْلٍ (میں تم پرنگہبان نہیں ۔ یونس:۱۰۷)۔ دوسری جگہ پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہی مطلب یوں ادا کیا : وَمَا اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ (تو ان لوگوں پر حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں کہ جبراً و قہراً بات منواۓ ق:۴۵)نیز فرمایا: لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ (تجھے ان پر داروغہ بنا کر نہیں بٹھادیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن تو انہیں راہ حق پر چلادینے کا ذمہ دار ہو۔ غاشیہ :۲۳) پھر فرمایا: فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ (جو کچھ تیرے ذمہ ہے یہی ہے کہ پیغام پہنچا دیا جائے۔ ان سے ان کے کاموں کا حساب لینا ہمارا کام ہے۔رعد:۴۰)

قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خد اکے رسولوں کا منصب تذکیر و تبلیغ کے اندر محدود تھا حالانکہ وہ خدا کی طرف سے مامور تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی دوسرے شخص کے لیے وہ کب گوارا کرسکتا ہے کہ وکیل، مصیطر اور جباربن جائے۔

تذکیر و تبلیغ اور پسند و قبول

دراصل اعمال انسانی کے تمام گوشوں میں اصل سوال حدود ہی کا ہے اور ہر جگہ انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے، یعنی ہر بات کی جو حد ہے اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔ دو حق ہیں ۔ دونوں کو اپنی اپنی حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ ایک حق ہے تذکیروتبلیغ کا ، ایک پسند و قبولیت کا۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے، اسے دوسروں کو بھی

سمجھائے لیکن اس کا حق نہیں کہ دوسروں کے حق سے انکار کردے۔ یعنی یہ بات بھلادے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے اور ایک فرد دوسرے کے لیے ذمہ دار نہیں ۔

تاریخ کو بارہا صدیوں تک اس بات کا انتظار کرناپڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلاف عقائد کی بناپر ذبح نہ کرے۔ اتنی بات سمجھ لے کہ "تذکیر" و"توکیل" میں فرق ہے۔ اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکہ اور فرانس کے "اعلان حقوق انسانی" سے شروع نہیں ہوئی۔ اس سے بارہ سو برس پہلے(نزول قرآن کے ساتھ) شروع ہوچکی تھی۔

خوف و حزن

قرآن نے اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بھی بات اس قدر نمایاں نہیں جس قدر یہ کہ "وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" (اور یہ قرآن میں کئی مقامات پر ارشاد ہوا ہے۔البقرہ۔۶۲) یعنی وہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہوجائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا اور اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے: خوف اور دکھ۔ جو

نہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی ، اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں ۔ زندگی کے جتنے کانٹے بھی ہوسکتے ہیں سب کو ایک ایک کرکے چنو، خواہ جسم میں چھبے ہوں ، خواہ دماغ میں ، خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں ، خواہ آخرت کی ۔ تم دیکھو گے کہ ان دوباتوں سے باہر نہیں ، یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا ۔ قرآن کہتا ہے کہ ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے، جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہوجاتے ہیں ۔ا س کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

عقل اور ماورائے عقل

قرآن اس بات کی بھی مذمت کرتا ہے کہ علم و بصیرت کے بغیر کوئی بات مان لی جائے اور اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بنا پر کوئی بات جھٹلادی جائے۔ اگر غور کروگے تومعلوم ہوجائے گا کہ انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی بات ہے۔ یا تو وہ عقل و بینش سے اس قدر کورا ہوجاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتا ہے اور ہرراہ میں آنکھیں بند کیے چلتا رہتا ہے، یا پھر سمجھ بوجھ کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالا تر ہوئی ، جھٹلا دی۔ اس طرح حقیقت کے اثبات و وجود کا مدار صرف ایک خاص فرد کی سمجھ پر رہ گیا۔

صورتیں دو ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں ، ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو، ایک یہ کہ تمہاری عقل سے بالا تر ہو۔ بہت سی باتیں ہوسکتی ہیں ، جن کا احاطہ تمہاری سمجھ نہیں کرسکتی ، لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ سرے سے خلاف عقل ہیں ، اس لئے کہ اول تو افراد کی عقلی قوت یکساں نہیں ، ثانیا عقل انسانی برابر نشو و ار تقا کی حالت میں ہے۔ ایک عہد کی عقل جن باتوں کا اثبات نہیں کرسکتی دوسرے عہد کے لیے وہ عقلی مسلمات بن جاتی ہیں ، ثالثاً انسانی عقل کا ادر اک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم ہوجاتی ہے۔

مرد عورت کی اخلاقی مساوات

قرآن نے مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا۔ سورۂ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تصریح کر رہی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔[1] چنانچہ جس طرح وہ

---

[1] اشارہ ہے اس آیت کی طرف: لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ (النساء۔ ۳۲)

نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے اسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح ایمان والی عورتیں ہیں ۔ جس طرح اطاعت گذار مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانت عورتیں ہیں ، جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں ، اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں ۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بہ کثرت اس کا ذکر کرنے والے ہیں ، اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بہ کثرت ذکر کرنے والیاں ہیں ۔

قرآن کریم کی شہادت

مردوں کے لیے فرمایا:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (سورة توبہ: ۱۱۲)

”(اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے)توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، اللہ کی حمدو ثنا کرنے والے، سیروسیاحت کرنے والے، رکوع وسجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے۔“

“مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں)ان کا حصہ ہے۔ اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں)ان کا حصہ ہے”۔

عورتوں کے لیے بھی فرمایا:

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ (سورہ تحریم :۵)

"مسلم عورتیں ، مومن عورتیں ، فرمانبردار ، توبہ کرنیوالیاں ،عبادت کرنے والیاں ، سیر و سیاحت کرنے والیاں ۔"

منافقوں کا ذکر کیا تو دوجنسوں کا کیا "

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (سورہ توبہ: ۶۷)

"منافق مرد اور منافق عورتیں ، سب ایک دوسرے کے ہم جنس ، برائی کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں ۔"

پھر فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۝۳۵

(سورة احزاب : ۳۵)

"مسلم مرد اور مسلم عورتیں اورمومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور صدق پر کاربند مرد اور صدق پر کار بند عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور اپنی

حفاظت کرنے والے پاکباز مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی پاکباز عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور بہت ذکر کرنے والی عورتیں ان کے لیے اللہ کے ہاں مغفرت اور بڑا درجہ ہے۔”

غور کرو کسی وصف میں تفریق نہیں ،کسی فضیلت میں امتیاز نہیں ، کسی بڑائی میں عدم مساوات نہیں ۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلہ میں زیادہ بد اخلاق ہے؟

صبر اور شکر

”صبر” کے معنی ہیں مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلوں میں جمے رہنا۔ ”شکر“ کے معنی ہیں اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں (اور نعمتوں) کی قدر کرنا اور انہیں ٹھیک ٹھیک کام میں لانا ۔ خدا کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو قوم (مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلہ میں ثبات و استقامت پر استوار رہتی ہے اور)خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر بجالاتی ہے اور ان سے ٹھیک طورپر کام لیتی ہے۔ خدا اسے اور نعمتیں عطا فرماتا ہے، لیکن جو کفران نعمت کرتی ہے یعنی قدر شناسی نہیں کرتی ، محرومی و نامرادی کے عذاب میں گرفتار ہوجاتی ہے اور یہ اللہ کا سخت عذاب ہے ، جو کسی انسانی گروہ کے حصہ میں آتا ہے۔

غور کرو یہ حقیقت حال کی سچی تعبیر ہےکہ جو فرد یا گروہ خداکی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا ہے مثلاً خدانے اسے فتحمندی و کامرانی عطا فرمائی ہے وہ اس نعمت کو پہچانتا ، اسے ٹھیک طورپر کام میں لاتا اور اس کی حفاظت سے غافل نہیں ہوتا،وہ اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا مستحق ہوجاتا ہے یا نہیں ؟ جو ایسا نہیں کرتا، اس کی نامرادی و تباہی میں کوئی شک ہوسکتا ہے؟

اکتساب مال اور انفاق مال

ہر انسان کی ذہنی و جسمانی استعداد یکسا ں نہیں ہوتی، اس لیے وسائل معیشت کے حصول کے اعتبار سے بھی سب کی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ کسی کو کمانے کے زیادہ مواقع حاصل ہوگئے۔ کسی کو تھوڑ ے۔ پہلے قوت میں مقابلہ ہوا، طاقتور نے کمزور کو مغلوب کرلیا۔پھر ذہن و جسم کا مقابلہ شروع ہو اور ذہنی قوت نے جسمانی قوت کو مقہور کرلیا۔

قرآن اس صورت حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ حیثیت کے اعتبار سے تمام انسانو ں کی حالت یکساں نہیں ، لیکن یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ حصول و رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو اورکسی کو ملے، کسی کو نہ ملے۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا ، دنیا کے سامان رزق سے حصہ پانے کا یکساں طورپر حقدار ہے۔

دراصل قرآن کی اس تہ میں یہ بنیادی اصل

کام کررہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے مختلف افراد اور جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور منقسم تسلیم نہیں کرتا ، بلکہ سب کو ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں ، ایک دوسرے کے شریک حال ہیں ۔

(قرآن) کہتا ہے کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ تم انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کرسکتے۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ تم جس قدر کماسکتے ہو کماؤ، لیکن یہ نہ بھولو کہ زیادہ سے زیادہ کمانا، زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں ۔ وہ کہتا ہے افراد کے ہاتھ کمائی کے لیے ہیں ، لیکن جماعت کا حق خرچ کرانے کا ہے۔

غرض جہاں تک نظام معیشت کا تعلق ہے، قرآن نے اکتساب مال کا معاملہ، انفاق مال کے ساتھ وابستہ کردیا ہے اس لئے کوئی کمائی جائز نہیں تسلیم کی جاسکتی، اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتناز کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازے کھلا نہ رکھے، قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک اور مستحق عقوبت ہے۔

بدعملی کا بڑا مرکز

انفرادی زندگی میں بدعملی کا بڑا مرکز دنیوی خوشحالی کی زندگی ہے۔ خوشحالی و ثروت کی حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اگر کسی جماعت میں پھیلی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر

کوئی برکت نہیں اور اگر صرف چند افراد میں سمٹی ہوئی ہوتو اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ، کیونکہ جب دولت صرف چند افراد کے قبضہ میں آگئی ، باقی افراد جماعت محروم رہ گئے تو قدرتی طورپر ہر طرح کا غلبہ وتسلط چند افراد کے ہاتھ آجائے گا اور ایسے غلبہ و تسلط کا نتیجہ غرور باطل اور استکبار عن الحق ہے(اس صورت حال کی الم انگیز مثالیں ہر طرف موجود ہیں)۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس جماعتی خوشحالی کو اللہ کا سب سے بڑا فضل قرار دیتا ہے، اسی کو انفرادی حالت میں “فتنہ” اور“متاع غرور” بھی کہتا ہے۔

آج تمام دنیا میں شور مچ رہا ہے کہ انفرادی سرمایہ داری دنیا کے لیے مصیبت ہے ، لیکن قرآن چودہ سوبرس پہلے اسے “فتنہ” قرار دے چکا اور اس کے لیے اکتناز کا لفظ بول چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا

(سورة توبہ: ۳۴)

”اور جو لوگ چاندی اور سونا اپنے ذخیروں میں جمع کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے ہ”

مشکل یہ ہے کہ جب تک قرآن کی صدا قرآن کی صدا ہے تمہاری نظروں میں چبھتی نہیں ، جب وہی بات وقت کے ذہن و فکر سے اٹھنے لگتی ہے تو فوراً اس کی پرستش شروع کردیتے ہو۔

فضیلت و کامرانی کے طریقے

سورہ اعراف میں ہے:

وَ اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَی الۡہُدٰی لَا یَسۡمَعُوۡا ؕ وَتَرٰىہُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَہُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الۡعَفۡوَ وَاۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۱۹۹﴾

(آیت ۱۹۸۔ ۱۹۹)

"(اے پیغمبر) اگر تم ان لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو ہرگز تمہاری پکارنہ سنیں گے تمہیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہاری طرف تک رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے نہیں (بہرحال) نرمی و گزر سے کام لو، نیکی کا حکم دو، جاہلوں کی طرف متوجہ نہ ہو۔"

(دیکھیے)چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت وکامرانی کے تمام طریقے واضح کردیے ہیں "خُذِ الۡعَفۡوَ"، "امر بالمعروف" اور "اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰہِلِیۡنَ" یعنی نا سمجھوں کی ناسمجھی بخش دینا، نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا اور جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا۔ سرسری نظر میں پتا نہیں لگے گا، اچھی طرح اور بار بار غور کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کی ساری عملی مشکلات ان تین اصلوں سے حل نہیں ہوجاتیں ؟

آیت ۱۹۸ میں فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ تجھے دیکھتے نہیں کیونکہ اگر دیکھتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔ سو ایک دیکھنا سلمان ضاللہعنہ فارسی کا تھا، جو پہلی ہی نگاہ میں پکار اٹھا : واللّٰہ ما

ھذا الوجہ وَجہ لکذاب (خدا کی قسم یہ صورت جھوٹے آدمی کی ہو نہیں سکتی) اور ایک دیکھنا ابوجہل کا تھا کہ مَالِ ھٰذَا الرَّسُولِ یَاکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ (یہ کیسا نبی ہے کہ آدمیوں کی طرح غذا کا محتاج ہے اور بازاروں میں پھر تا ہے؟ الفرقان:۷)

وفائے عہد اور قرآن

عہدجاہلیت کے عرب وفا ء عہد کی اخلاقی قدر وقیمت سے بے خبر نہ تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو اپنے اور اپنے قبیلے کے مفاخر میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ وفائے عہد کو دیتے تھے، لیکن جہاں تک جماعتی معاہدوں کا تعلق ہے، وفائے عہد کا عقیدہ کوئی عملی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک قبیلہ ایک قبیلہ سے معاہدہ کرتا تھا، کل دیکھتا تھا کہ اس کے مخالف زیادہ طاقتور ہوگئے ہیں تو بے دریغ ان سے جاملتا تھا اور معاہدوحلیف پر حملہ کردیتا تھا۔ اگر کسی دشمن فریق سے (عہد جاہلیت کے عرب) امن کا معاہدہ کرتے، پھر دیکھتے کہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع پیدا ہوگیا ہے تو ایک لمحہ کے لیے بھی معاہدہ کا احترام انہیں حملہ کردینے سے نہیں روکتا تھا اور بے خبر دشمن پر جاگرتے تھے۔

قرآن راستبازی کی جو روح پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ایسی بد اخلاقی

گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے وفائے عہداور احترام پیمان کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اس درجہ بلند، قطعی، بے لچک اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی بھی گوشہ اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ فرد ہو یا جماعت، ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی ، عزیز ہوں یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہوں یا غیر ہم قوم و مذہب ، دوست ہوں یا دشمن ، امن کی حالت ہو یا جنگ کی، لیکن کسی بھی حال میں عہد شکنی جائز نہیں ، وہ ہر حال میں جرم ہے، معصیت ہے۔ اللہ کے ساتھ ایک بات کرکے اسے توڑدینا ہے عذاب عظیم کا اپنے کو مستحق ثابت کرنا ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا وفائے عہد پر زوردیا ہے اور جہاں کہیں مومنوں کے ایمانی فضائل کی تصویر کھینچی ہے، یہ وصف سب سے زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے:

۱۔ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوا (البقرة: ۱۷۷)

”اور جب قول و قرار کرلیتے ہیں تو اس کا پاس کرتے ہیں ۔“

۲۔ وَالَّذِيۡنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهۡدِهِمْ رٰعُوۡنَ ۸ۙ (المؤمنون ۔۸)

”نیز جن کی حالت یہ ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں ۔“

احادیث میں منافق کی یہ پہچان بتلائی گئی ہے: اِذَا وَعَدَ اَخلَفَ:”جب وعدہ کرے گا پورا نہ کرے گا۔“

سورۃ نحل آیت ۹۲ میں فرمایا:

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ

”تم آپس کے معاملے میں اپنی قسموں کو مکر و فساد کا ذریعہ بناتے ہو، اس لیے کہ ایک گروہ کسی دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے (یادرکھو) اس معاملے میں اللہ تمہاری (راستبازی اور استقامت کی) آزمائش کرتا ہے۔“

پھر اس طرح کی بد عہدی کی مثال کیا ہے ؟ فرمایا :

كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (اس عورت کی سی ہے جس نے بڑی جانفشانی سے سوت کا تا ، پھر خود ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے برباد کردیا۔ النحل۔۹۲) یعنی جب ایک شخص یا ایک گروہ کوئی معاہدہ کرتا ہے تو اس کی پختگی کے لیے بڑی باتیں کرتا ہے، ہر طرح دوسرے فریق کو یقین دلاتا ہے ، پھر اگر ایک بات اتنی کوشش کے بعد پختہ کی گئی ہے تو کیونکر جائز ہوسکتا ہے کہ جس نے کل پختہ کی تھی، وہی آج اسے اپنے ہاتھوں سے توڑکرر کھ دے۔

رسول اکرم ﷺ کی شان رافت ورحمت

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ (توبہ:۱۲۸، ۱۲۹)

”تمہارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے، تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کا بڑاہی خواہشمند ہے، وہ مومنوں کے لیے شفقت اور رحمت رکھنے والا ہے، اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے، کوئی معبود نہیں مگر اس کی ذات، میں نے اسی پر بھر وسا کیا وہ تمام عالم ہستی (کی جہانداری) کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔“

ان دو آیتوں میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا: اللہ کا رسول تم میں آگیااس نے اپنا فرض رسالت ادا کردیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آنکلا تھا۔ سنت الٰہی کے مطابق خود تمہیں میں پیدا ہوا اور چونکہ تمہیں میں سے ہے ، اس لیے اول سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمہاری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں ۔ اس کا لڑکپن بھی تم میں گزرا اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو اس نے تم سے کہیں چھپ کر زندگی بسر نہیں کی، اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پھر جو کچھ گزرنا تھا، گزرا۔ تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سن لیے۔ فتح وکامرانی میں ان کی تصدیق بھی کرلی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک بات کی

سچائی آزمانہ لی ہو۔

پھر (رسول ﷺ کے) ایک ایسے وصف پر زور دیا ، جو منصب رسالت کے لیے اور ہر اس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو، سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت فرمایا: اس سے زیادہ کوئی بات تمہارے لیے یقینی نہیں ہوسکتی کہ وہ سرتا پاشفقت و رحمت ہے۔ وہ تمہارا دکھ برداشت نہیں کرسکتے۔ تمہاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے ہو، خواہ روح کے لیے ، اس کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے۔ وہ اس کے لیے ایسا مضطرب قلب رکھتا ہے کہ اگر اس کی بن پڑتی تو ہدایت وسعادت کی ساری پاکیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلادیتا ۔ پھر اس کی یہ شفقت و محبت تمہارے ہی لیے نہیں وہ تو تمام مومنوں کے لیے خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے"رؤف رحیم" ہے۔

"رؤف" "رافت" سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری اور مصیبت پر جوش میں آئے۔ پس رافت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے۔ دونوں کے جمع کردینے سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت و تاثیر کے ساتھ واضح ہوگیا۔

خدا نے یہ دونوں وصف جا بجا اپنے لیے فرمائے ہیں اور یہاں اپنے رسول کے لیے بھی فرمائے۔

پیام موعظت کی ضرورت

اس کے بعد مجمع مخاطبین یہ سب کچھ دیکھ لینے اور تجربہ کرلینے کے بعد بھی ادائے فرض سے اعراض کرے تو اسے پیغمبر تم آخری اعلان کرو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا تھا اور اب بھی بس کرتا ہے۔ وہ اپنے کلمۂ حق کا محافظ ہے۔ اس کی مشیت نے جو فیصلہ کر دیا ہے۔ بہرحال ہوکر رہنے والا ہے۔ اس کا قیام و عروج کسی خاص ملک اور قوم کی پشت پنا ہی پرموقوف نہیں ۔ میرا بھروسہ اللہ ہی پرتھا، اسی پر ہے، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوگیا۔

یہ پیام موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا؟ اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں : سورة (یعنی سورة توبہ) کے نزول کا وقت اورسورة کے مطالبے یہ سورة اس وقت نازل ہوئی جب تمام عرب میں کلمۂ حق سربلند ہوچکا تھا اور گو قرآن کی عالمگیر فیروز مندیوں کی خبر دے دی تھی ، تاہم ان لوگوں کے لیے جو کل تک غربت و بیکسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے۔ تمام عرب کا مسلمان ہوجانابڑی سے بڑی کامرانی تھی اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہوجائے۔ غزو تبوک کی تیاریوں میں بعض سے جو تساہل ہوا اس کی تہ میں بھی اس حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس سورة میں اس تفصیل اور شدت کے ساتھ استعداد کار

اور عزم وہمت کی گئی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسری سورۃ میں نہیں ملتی۔

تاریخ انسانیت کے نو ادر

کوئی شخص کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے، لیکن تاریخ اسلام کے چند واقعات اس درجہ واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں کہ ان سے انکار کیا جاسکے۔ ازاں جملہ یہ کہ جو جماعتیں پیغمبر اسلام صلعم کی مخالف تھیں ، ان کے تمام کا م اول سے آخر تک ظلم و تشدد ، دغا و فریب اور وحشت و تشددپر مبنی رہے اور پیغمبر اسلام صلعم اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا اس کا ایک ایک فعل، صبر و تحمل ، راستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا:

۱۔ مظلومی میں صبر۔
۲۔ مقابلہ میں عزم۔
۳۔ معاملہ میں راستبازی۔
۴۔ طاقت و اختیار میں درگزر۔

تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں ، جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے (جس طرح رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکت کے اندر جمع ہوئے اور پورا عہد مبارکۂ نبوت ان نوادر کی درخشانیوں سے جگمگا رہا ہے۔ گویا سیرۃ طیبہ کا نچوڑ یہی ہے جو حقیقت میں انسانیت عالیہ وعظمٰی کا سدرۃ المنتہٰی ہے)

"نذیر" و "بشیر"

انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو چاہتے ہیں کہ اسے انسانیت و بندگی کی سطح سے بلند کرکے دیکھیں ۔ لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام ﷺ کی حیثیت صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کردی کہ ہمیشہ کے لیے اس گمراہی کا ازالہ ہوگیا۔ صرف یہی ایک بات ان کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے۔

جو دنیا پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہشمند تھی، اسلام کے پیغمبر ﷺ نے اس سے اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب دان تسلیم کرلو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی نسبت جو بات سنائی، یہ تھی کہ میں انکار و بدعملی کے نتائج سے خبر دینے والا "نذیر" اور ایمان و نیک عملی کی برکتوں کی بشارت دینے والا "بشیر" ایک بندہ ہوں ، اگر غیب داں ہوتا تو زندگی کا کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا:

کیا ایسے انسان کی زبان سے سچائی کے سوا کوئی بات نکل سکتی ہے؟

چہ عظمت دادہ ای یا رب
بخلق آں عظیم الشان
کہ "انی عبدہ" گوید بجائے
"قول سبحانی"

رحمت و شفقت کا ابر گہر بار

آدمیت احترام آدمی

ہدایت کے لیے لامتنا ہی تڑپ

رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں مخلوق کے لیے بے پایاں شفقت ورحمت کا جو سمندر موجزن تھا، اس کا ذکر کتاب میں پے درپے آتا رہا ہے، ساتھ ساتھ مثالیں پیش ہوتی رہی ہیں ۔ باقی رہی شفقت و رحمت کی مفصل کیفیت تو اگر میں بیان کرنا بھی چاہوں تو الفاظ اور بیا ن مطالب کی صلاحیت کہاں سے لاؤں ؟ وہی ایرانی شاعر کامعاملہ ہے:

کتاب فضل ترا آب بحر کافی نیست
کہ تر کنم سرانگشت وصفحہ بشمارم

ہمارے لیے کلام الٰہی سے بڑھ کر قاطع، فیصلہ کن اور دل پذیر شہادت کوئی نہیں ہوسکتی۔ارشاد ہوتا ہے:

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰی اٰثَارِہِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِہٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ (کہف:۶)

“(اے پیغمبر تری حالت تو یہ ہورہی ہے کہ) اگر

یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائیں تو عجب نہیں تو ان کے پیچھے افسوس کے مارے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے۔”

کیا خلق خدا کی دنیوی اور اخروی بہبود کے لیے انتہائی محبت و شیفتگی کی کوئی روشن تر شہادت ہوسکتی ہے۔ جس کا دائمی ذکر اس کتاب مقدس میں محفوظ ہوگیا ہے جو ذکرٌللعٰلمین ہے؟ یہ غمگینی اور اندوہناکی روئے زمین کے تمام انسانوں اور پوری نوع بشر کے لیے تھی، خواہ ان کا تعلق کسی نسل، کسی خطے اور کسی قوم سے تھا۔

انبیا ئے کرام ہدایات اصلاح کے طالب ہی نہیں ،عاشق ہوتے ہیں ۔ انسانوں کی گمراہی ان کے دلوں کا ناسور ہوتی ہے اور ہدایت کا جوش ان کے دل کے ایک ایک ریشے کا عشق۔اس سے بڑھ کر ان کیلیے کوئی غمگینی نہیں ہوسکتی کہ ایک انسان سچائی سے منہ موڑلے اور اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی شادمانی نہیں ہوسکتی کہ ایک گمراہ قدم راہ راست پر آجائے۔ قرآن میں اس صورت حال کی شہادتیں جا بجا ملتی ہیں ۔

غور طلب حقائق

آپ نے اس صورت حال کے اسباب پر بھی کبھی غور فرمایا؟ یہ خیال کرلینا تو انتہادرجے کی سخافت و کم عقلی کا ثبوت ہوگا کہ داعی حق ایک انسان نما مشین ہوتا ہے، جو اوپر سے

نازل شدہ ہدایات کو خلق خدا کے سامنے دہراتا رہتا ہے،حاشاو کلا۔

۱۔ مشیت ایزدی جن مقدس ہستیوں کو دعوت حق کے لیے چنتی رہی ان کی فطرتیں ہم جنسوں کی اصلاح و فلاح اور سودو بہبود کے غم میں سراپا سوزو درد ہوتی تھیں ۔اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی داعی حق روزگار کی حد درجہ حوصلہ فرسا مشکلات کے باوجود اپنے وظیفہ کی بجا آوری پر چٹان کی طرح جما کیونکر رہ سکتا تھا؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ انتہائی ناسازگار حالات میں یہ کیوں فرماتے کہ خدا کی قسم ‘ اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند لاکر رکھ دیں ،تب بھی میں اپنے فریضہ دعوت سے باز نہ آؤں گا، یہاں تک کہ خدا اس کام کو پورا کردے یا خود میں اس پرنثار ہو جاؤں ۔

۲۔ قرآن مجید اس حقیقت کی پے درپے گواہی دے رہا ہے کہ ہر داعی حق نے آغاز دعوت کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کردیا کہ میں اس کام کے لیے کسی سے اجر کا طلبگار نہیں ۔ میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے۔ اگر ہرداعی حق کے قلب مقدس میں ہم جنسوں کوراہ راست پر لانے کے لیے انتہائی تڑپ نہ ہوتی تو ہر قسم کی ذاتی اغراض سے کامل برات کا دعویٰ کیوں بار بار زبان پر لایا جاتا؟

۳۔ پھر ہر داعی حق پر ایک ایک فعل اور ایک

ایک حرکت کے نتائج و عواقب برای العین آشکار ہوتے ہیں ۔ انجام بد کا تصور ایک شے ہے، انجام بد کی تلخیوں اور نا خوشگواریوں کا مشاہدہ بالکل دوسری شے ہے۔

۴۔ اگر کسی کا قدم گمراہی میں بڑھتا جائے تو عام لوگ سمجھیں گے کہ وہ ازروئے شریعت عذاب کا سزا وار ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بخش دے تو دوسری بات ہے، لیکن داعی حق پر معاملہ جزا اسی طرح عیاں ہوتا ہے جس طرح سلیم البصارت آدمی کودن کے وقت آفتاب نظر آتا ہے۔ پھر ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کی بناءپر سب کو تعزیر و عقوبت کی حوصلہ فرسائیوں اور شکیب گدازیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے داعی حق جس غمگینی و اندوہناکی اور جس اضطراب و بے تابی کا تختہ مشق بنتا ہوگا، اس کی شدت اور و سعت حدود ہمارے محدود اور آلودہ اغراض ذہنوں میں کیونکر سما سکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ میں تمہیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں مگر تم آگ میں گر پڑتے ہو۔

۵۔ رسول اللہ ﷺ تمام مکارم و فضا ئل نبوت کے جامع تھے، کیونکہ آپ ﷺ پورے عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے معبوث ہوئے تھے،اس لیے تمام خصوصیات میں بھی سب سے افضل تھے۔ سورۃ کہف کی محولہ بالاآیت کے دو پہلو ہیں اور دونوں بہ ہر حال ہر اس فرد

کے پیش نظر ہونے چاہئیں جورسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات سے انتساب کا مدعی ہو:

الف: یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے جوش دعوت و اصلاح اور نوع بشر کے لیے بے پایاں شفقت کا صحیح نقشہ پیش کر رہی ہے۔

ب۔ ہر مدعی اسلام کا فرض ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" کی پیروی میں حضور ﷺ کی ان خصوصیتوں (جوش دعوت و اصلاح اور بے پایاں شفقت و رحمت) کا بھی بہتر عملی پیکر بنے۔

واقعہ طائف

حضور ﷺ کے سفر طائف کا ذکر کرتے ہوئے عرض کیا جا چکا ہے کہ دعوت حق کی جو سرگزشت دُنیا کے مذہبی دفتروں اور سفینوں میں محفوظ ہے ، اس میں سے کوئی ایسا واقعہ دکھایا نہیں جا سکتا جو طائف میں حضور ﷺ کی دعوت حق کا مثیل بن سکے ،دیکھیے:

۱۔ سفر طائف کا مقصد اس کے سوا کیا تھا کہ اہل طائف ہدایت کی راہ پر لگ جائیں ؟ اس میں انہی لوگوں کی بھلائی اور بہتری تھی، دنیوی بھی اور اخروی بھی، حضور ﷺ نے صرف فریضۂ تبلیغ ادا کرنے میں ہر زحمت گوارا فرمالی تھی۔

۲۔ طائف کے گمراہ اور حق ناشناس رئیسوں نے حضور ﷺ سے جو سلوک روا رکھا وہ ہر زاویہ نگاہ سے ظلم و تعدی کا ایک نہایت

افسوسناک مظاہرہ تھا۔ عرب کے دورِ جاہلیت میں ایسے مظاہروں کی کہیں بھی کمی نہ تھی۔

۳۔ ان رئیسوں کی انگیخت پر اوباشوں نے رسول اللہ ﷺ کو سنگ باری کا ہدف بنایا ، یہاں تک کہ پیشانی مبارک کا خون بہہ بہہ کر پائے مبارک تک پہنچ گیا اور آپ ﷺ نے ایک باغ میں پناہ لی۔

۴۔ اس درد ناک حالت میں بھی آپ ﷺ کے قدوسی تحمل پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس موقع پر بارگاہ باری تعالیٰ میں جو دُعا کی،وہ اپنے محل پر منقول ہے۔ اس میں سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا جس سے تلخی و ناخوشگواری کی بُو سُونگھی جا سکے۔ اللہ کی لگن کے سوا حضور ﷺ کے قلب صافی میں اور کسی چیز کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔

۵۔ پھر یہ بھی فرمایا: میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے کیوں دُعا مانگوں ؟ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو کیا ہُوا، ان کی آئندہُ نسلیں ضرور ایک خدا پر ایمان لائیں گی۔

کیا اپنے پیغام کی صداقت پر بے پایاں یقین اور ہم جنسوں کے لیے بے پایاں رحمت کی ایسی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ کیا ہدایت کی لامتناہی امید کا کوئی ایسا نقشہ آپ کو کسی دوسری جگہ نظر آسکتا ہے؟

تاریخ گواہ ہے کہ آئندہ نسلیں نہیں ، خود وہ نسل بھی حضور ﷺ کے دست مبارک پر ایمان لائی،

جس کے ہاتھ چند سال پیشتر حضور ﷺ کو سنگ باری کا نشانہ بنا چکے تھے۔ یقین رکھیے واقعہ طائف اپنی معنوی بہ مثالی ہی کی بن پر سیرۃطیبہ کا ایک اہم موڑ بن گیا، جہاں سے ہجرت کے مقدمات شروع ہوگئے اور دین حق کی دعوت اس منزل کے دروازے پر پہنچ گئی، جس میں "یَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللہِ اَفْوَاجًا ۲۔" (النصر۔ ۲) کا نظارہ مہر و ماہ کی آنکھوں کے لیے جشن عید بننے والا تھا۔

عہد نبوی ﷺ کی جنگیں

ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کی ایک روشن دستاویز عہد نبوی کی جنگیں بھی ہیں ، جن کی حقیقی حیثیت اور معنوی خصوصیت پر اب تک بہت کم توجہ فرمائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کسی بھی دور میں جنگ کے خواہاں نہ تھے جو دین عالم انسانیت کے لیے صلح و امن، محبت و اخوت اورفلاح و بہبود کا پیغام تھا، اس میں رزم و پکار کے لیے کون سی گنجائش ہوسکتی تھی؟ لیکن قریش مکہ کے غرور و تکبر اور ظلم و جور نے شریف و حق پرست انسان کے لیے جینا دو بھر کردیا، حالانکہ ان کی نکو کاری ِ حق پرستی اور شرافت کسی کے لیے بھی باعث تکلیف نہیں ہوسکتی تھی،مجبور ہوکر پہلے ایک جماعت کو حبش جانے کی اجازت دے دی گئی۔ قریش مکہ نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا،پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت

کاانتظام ہوا۔ رسول اللہ اور صحابہ کرام پشتوں کے گھر بار چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے لیکن یہ بُعد مکانی بھی قریش کی آتش اشتعال روک نہ سکا۔ بلکہ ان کی پیش دستیوں اور آزار رسانیوں کا سلسلہ تیز تر ہوگیا۔ ان حالات میں حفظ و دفاع اور پیش بندیوں کے سوا چارہ نہ رہا اور حفظ و دفاع اس دنیا میں ہر فرد و جماعت کا اولین فطری حق ہے، جس پر امن عالم کا انحصار ہے۔

غزوات و سرایا

رسول اللہ کو جن مہموں سے سابقہ پڑا انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن مہموں کی قیادت حضور نے بہ نفس نفیس فرمائی انھیں غزوات کہتے ہیں ، جن مہموں کی سرعسکری پر دوسرے اصحاب مامور ہوئے انیں سرایا (جمع سریہ) کہا جاتا ہے۔

قاضی محمد سلیمان مرحوم منصور پوری نے "رحمۃ للعٰلمین" کی دوسری جلد میں بیاسی غزوات، سرایا کا ذکر نام بنام کیا ہے اور ان کی تفصیلات بتائی ہیں ۱ ۔ بعض کتابوں میں اس سے بہت کم تعداد کا ذکر ہوا ہے لیکن اصل سوال تعداد کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے۔ ان سب کو عموماً غزوات یا سرایا ہی قرار دے لیا گیا ہے حالانکہ ان میں سے اکثر ایسی تھیں ،جنھیں کسی بھی زاویہ نگاہ سے جنگیں سمجھنا یا جنگیں قرار دیناصحیح نہ ہوگا۔مثلاً ابن حزمؒ

حدیبیہ کو بھی غزوہ قرار دیا ہے حالانکہ نہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے ارادے سے نکلے تھے،نہ جنگ کی نوبت آئی۔ آپ ﷺ صرف عمرہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ جس کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے اور حضورﷺ کا یہ سفر ذی قعدہ میں ہوا تھا، جو شہرالحرم میں سے تھا یعنی جس میں کشمکش یا روک تھام قریش کے لیے جائز ہی نہ تھی۔ قاضی سلیمان مرحوم نے انہیں مہمیں بھی نہیں کہا بلکہ محض "نقل و حرکت" قرار دیا ہے اور یہ تعبیر ان میں سے اکثر کی حقیقی کیفیت کی صحیح آئینہ دار ہے۔

مہموں کی نوعیت

قاضی سلیمان مرحوم کی بیان کردہ بیاسی مہموں میں سے بیشتر کی کیفیت خلاصۃً ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱۔ ان میں سے بعض کو جنگیں قراردینا واقعۃً غلط ہے۔ مثلاً رجیع اور بئر معونہ کی طرف جو لوگ بھیجے گئے وہ نہ فوجی دستے تھے نہ اس غرض سے بھیجے گئے تھے کہ لڑیں ۔ وہ محض مبلغ اور مقرری تھے، اس وجہ سے بھیجے گئے تھے کہ لوگوں نے قرآن اور اسلام سیکھنے کی غرض سے ان کے ارسال پر اصرار کیا تھا۔بئر معونہ بھیجے جانے والے لوگوں کے لیے ایک رئیس قبیلہ نے ذاتی ضمانت بھی قبول کرلی تھی۔ یہ کل اسی(۸۰) افراد تھے۔ ستر بئرمعونہ اور دس رجیع بھیجے گئے۔

ان دونوں جماعتوں کو اچانک غداری سے سابقہ پڑا۔ اسی(۸۰) میں سے صرف ایک محفوظ رہا، باقی سب نے شہادت پائی،ان کا نقصان بھی جنگی نقصانات میں محسوب نہیں ہوسکتا۔

۲۔ پھر ان میں سے خاصی مہمیں ایسی تھیں جن میں بہت کم آدمی بھیجے گئے، اتنے کم کہ انھیں جنگوں میں شامل کرنا مضحکہ خیز ہوگا۔ مثلاً:

آدمی	مہمیں
ایک ایک	۵
پانچ پانچ	۲
دس دس	۲
بارہ بارہ	۲
پندرہ پندرہ	۳
بیس بیس	۴
پچیس پچیس	۲
تیس تیس	۵
چالیس چالیس	۲

گویا ستائیس مہموں میں اتنے تھوڑے آدمی بھیجے گئے کہ انھیں جنگیں کہا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ دراصل طلایہ گرد دستے تھے،جو اس وجہ سے وقتاً فوقتاً اطراف میں بھیجے گئے کہ دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق معلومات حاصل کریں تاکہ اس کے مفسدانہ منصوبوں سے آگاہ ہوکر مناسب دفاعی تد بیریں عمل میں لائی جاسکیں یا کہیں کوئی فتنہ انگیز فرد قتل وغارت کے

عادی قبیلوں کو برانگیختہ کرکے مدینہ منورہ پر چھاپا مارنے کے لیے تیار کررہا تھا۔ ایک جانباز گیا اور اس فتنۂ انگیز کو " وَ الْفِتْنَۃُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ" (البقرۃ ۲۱۷) کے اصول پر ختم کرکے چلا آیا اور وہاں لوگ امن چین سے بیٹھ گئے۔

۳۔ حدیبیہ کا ذکر پہلے آچکا ہے،وہ جنگ تھی ہی نہیں ، اس کا مقصد ادائے عمرہ تھا۔ آخر قریش سے دس سال کے لیے صلح ہوگئی نیز قرار پاگیا کہ مسلمان آئیندہ سال آکر عمرہ ادا کرلیں ۔ قریش تین روز کے لیے شہر مکہ سے نکل کر آس پاس کے پہاڑوں میں جا بیٹھیں گے۔

۴۔ بعض مہمیں اس وجہ سے تیار ہوئیں کہ دشمن کے چھاپا مار دستے اچانک حملہ کرکے چند امن پسند شہریوں کو خاک و خون میں تڑپا چکے تھے، ان کا تعاقب کیا گیا۔ ایسی مہمیں بھی عرفاً جنگ نہیں سمجھی جاسکتیں ۔

۵۔ بعض مہمیں اطراف مدینہ کے قبیلوں کے پاس گئیں اور ان سے معاہدے ہائے صلح وامن کرلیے۔ان معاہدوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ دشمن کی فتنہ انگیزی کا دائرہ محدود کر دیا جائے اور قبیلوں کو دشمن کی عیاریوں کا تختہ مشق نہ بننے دیا جائے۔

۶۔ ایک مثال ایسی بھی ہے کہ کچھ لوگ باہر سے آئے جو بیمار تھے انھیں رحم کھا کر مدینہ کی چراگاہ میں ٹھہرا دیا گیا تا کہ کھلی آب و ہوا

میں رہیں اور اونٹنیوں کا دودھ پئیں، وہ تندرست ہوگئے لیکن دور جاہلیت کے احسان ناشناسوں کی طرح انہوں نے چراگاہ کے رکھوالے کو شہید کر ڈالا اور اونٹ ہنکالے گئے۔ ان کا بھی تعاقب کرکے انہیں پکڑا اور مناسب سزا دی گئی۔ اسے کون جنگ کہنا پسند کرے گا؟

۷۔ ایک مرتبہ بعض قبائلیوں نے اچانک چراگاہ پر حملہ کردیا تھا اور کچھ اونٹ ہنکالے گئے تھے۔ ان کا بھی تعاقب کیا گیا اور اونٹ واپس لے لیئے گئے، یہ بھی جنگ نہ تھی۔

جانی نقصان

سیرت نگاروں نے ان تمام مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دے لیا اور اس طرح تعداد خاصی بڑھ گئی حالانکہ ان میں سے ایک بھی مہم ایسی نہ تھی جسے جنگ کہا جاسکے۔ بلاشبہ بعض مہمیں ایسی ہیں کہ اطلاع ملی،فلاں مقام پر لوگ اس غرض سے جمع ہورہے ہیں کہ مدینہ منورہ پر حملہ کر کے اول لوٹ مار کاشوق پورا کریں دوم قریش مکہ کی نظروں میں اعتبار پائیں ،جوہر اس گروہ کو سر پر بٹھانے کے لیے تیار رہتے تھے‘ جس کے ذریعے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے ، ایسے بعض گروہوں کے خلاف اچانک اقدام کرکے انہیں منتشر کر دیا گیا۔ ایسی مہموں میں مسلمانوں کو بھی جانی نقصان پہنچا اور غیر مسلموں کے آدمی بھی قتل ہوئے۔ غرض میں نے

قاضی سلیمان مرحوم کی درج کی ہوئی فہرست میں سے کم و بیش ستر مہمیں الگ کرلیں ، جنہیں کسی بھی اعتبار سے جنگ نہیں کہا جاسکتا اور ان کے جانی نقصان کے اعداد بھی قاضی صاحب مرحوم ہی کی فہرست کے مطابق جمع کیے تو نتیجہ یہ نکلا:

فریق	نقصان جان
مسلمان	۹۶
مخالفین	۱۸۸

بعض مہموں میں مخالفوں کے مقتولوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہوسکی اور قاضی صاحب مرحوم بھی انکا کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ وہ اعدادقیاساً شامل کر لینے چاہئیں تا ہم وہ پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوں گے ہاں اعداد میں بنو قریظہ کے ان افراد کا جانی نقصان شامل نہیں ، جنھیں سعد رضی اللہ عنہ بن معاذ کے فیصلہ ثالثی کی بنا پر موت کی سزا دی گی تھی، یہ سزا موسوی شریعت کے عین مطابق تھی اور سعد رضی اللہ عنہ کو بنو قریظہ نے خود ثالث بنایا تھا۔ ان مقتولین میں ایک عورت بھی تھی، جسے اس لیے سزائے موت ملی کہ اس نے قلعہ کی چھت پر سے ایک مسلمان پر چکی کا پاٹ گراکر شہید کردیا تھا، حالانکہ وہ دیوار کے سایہ صرف سستانے کے لے بیٹھ گیا تھا۔ یہ لوگ میدان جنگ کے مقتولین نہ تھے۔ اسی طرح رجیع اور بئر معو نہ کے مسلمان شہدا بھی مسلمانوں کے جانی نقصان میں شامل نہیں ۔

باقاعدہ جنگیں

جن مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دیا جاسکتا ہے، وہ بھی مسلمانوں کو بالکل ناخواستہ پیش آگئی تھیں اور ان میں بھی پیش دستی مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی تھی۔مثلاً

۱۔ غزوہ بدریوں پیش آگیا: رسول اللہ ﷺ نے اطلاع پاکر مدینہ منورہ سے نکلے کہ قریش کا وہ قافلہ تجارت شام سے لوٹ رہا ہے، جس کا پورا نفع مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری میں صرف ہونیوالا تھا ‘ اس قافلے کو روکنا ضروری تھا ۔ لیکن سالار قافلہ مختلف اطلاعات کی بناپر پہلے ہی عام راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے نکل گیا‘ جو دس بارہ میل مغربی جانب تھا۔ اس اثنا میں یہ اطلاع مل گئی تھی کہ قریش ایک ہزار کے قریب سواروں اور پیادوں کے ساتھ بدر پہنچ گئے ہیں ‘ نیزان کا ارادہ وہاں ٹھہرنے اور جشن منانے کا ہے۔ مسلمانوں کے لیے لڑنا اس وجہ سے ناگزیر ہوگیا کہ اگرطرح دبے جاتے تو اول قریش ان قبیلوں پردباؤ ڈالتے،جن سے مسلمانوں کے معاہدے ہوچکے تھے اور ان قبیلوں کے لیے دوبارہ مسلمانوں سے معاہدہ کرنے کی کیا صورت رہتی؟ دوم قریش مدینہ منورہ پر چڑھائی کر دیتے تو نتائج مسلمانوں کے لیے بدر جہا ز یادہ خطرناک ہوتے، جتنے بدر

میں لڑنے سے ہوسکتے تھے۔ لہذا بدر کومشیت ایزدی نے حق و باطل کی جنگ کا پہلا میدان بنادیا۔

۲۔ غزوہ احد اس لیے پیش آیا کہ قریش مکہ نے بدر کے انتقام میں مدینہ منورہ پر حملہ کیا تھا۔ قریش مکہ کی فوج کم از کم تین ہزار تھی،مسلمان زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات سو تھے ۔ تیراندازوں کے ایک گروہ کی غلطی کے باعث مسلمانوں کا سخت نقصان ہوا تا ہم میدان انہی کے ہاتھ رہا۔

۳۔ غزوہ احزاب بھی قریش مکہ اور یہود خیبر کی مشترکہ سازش کا نتیجہ تھا، جس میں قریش ویہود مختلف قبائل کو گوناگوں لالچ دے کر ساتھ لے آئے اور کم از کم دس ہزار افراد نے مدینہ منورہ پر ہجوم کیا اور دفاع کے لیے ایک طویل خندق کھودی گئی۔

۴۔ غزوہ خیبر اس وجہ سے پیش آیا کہ یہود خیبر نے احزاب میں ناکامی کے بعد غطفان اور دوسرے قبائل کو مدینہ منورہ پر ؛حملہ کے لیے آمادہ کر لیا تھا ۔ اس وجہ سے ناگزیر ہوگیا کہ اقدام کر کے فتنہ کی یہ آگ ہمیشہ کے لیے بجھادی جائے۔

۵۔ موتہ کی مہم اس سبب سے پیش آئی کہ موتہ کے مسیحی حاکم شرجیل نے رسول اللہ ﷺ کے سفیر کو ناحق قتل کرادیا تھا۔ سفیر کا قتل اس دور میں بھی ایک قبیح بین الاقوامی جرم تھا۔تین ہزار مجاہدین اس

خون نا حق کا انتقام لینے کے لیے بھیجے گئے
تھے۔ انھوں نے کم از کم ایک لاکھ فوج غنیم
کو میدان چھوڑ نے پر مجبور کردیا۔

۶۔ مکہ مکرمہ پر یورش اس وجہ سے ناگزیر
ہوگئی کہ قریش نے معاہدہ حدیبیہ کے باجود
اپنے ایک حلیف قبیلے کوشہ اور مدد دے کر
مسلمانوں کے قبیلے پر حملہ کرایا۔ رسول
اللہ ﷺ نے تلافی مافات کی دو صورتیں پیش
کر دیں ۔ یعنی یا تو ان لوگوں کا خون بہا دیا
جائے جو حملے کے باعث ناحق مارے گئے۔ یا
قریش اپنے حلیف قبیلہ کی پاسداری سے خود
ہاتھ اٹھالیں ۔ مسلمان بطور خود مناسب
فیصلہ کرلیں گے۔ قریش نے دونوں میں سے
کسی بھی صورت پر عمل نہ کیا اور مکہ
مکرمہ پر پیش قدمی کے سوا چارہ نہ رہا۔

۷۔ غزوہ حنین اس وجہ سے پیش آیا کہ فتح مکہ
کے بعد بنو ہوا زن اور بنو ثقیف مسلمانوں پر
حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے اور اندیشہ پیدا
ہوگیا تھا کہ حدود حرم میدان جنگ بنیں گے۔
محاصرہ طائف غزوہ حنین ہی کا شاخسا
نہ تھا۔

۸۔ تبوک کا سفر اس لیے اختیار کیا گیا کہ قیصر
کی طرف سے عرب پر حملے کی تیاریوں کے
متعلق متواتر خبریں موصول ہوئی تھیں ۔
رسول اللہ ﷺ تیس ہزار جانبازوں کی معیت
میں کٹھن منزلیں طے کر کے عرب کی شمالی
سرحد پر پہنچ گئے تاکہ لڑائی غنیم کے علاقے

میں ہو،بیس روز قیام فرمایا۔ کوئی لڑائی پیش نہ آئی اور حضور ﷺ مختلف گروہوں کو امان نامے دے کر لوٹ آئے۔

باقاعدہ جنگوں کے نقصانات

ان باقاعدہ جنگوں کے جانی نقصانات کا اندازہ قاضی محمد

سلیمان مرحوم کے فراہم کردہ اعداد کے مطابق درج ذیل ہے:[1]

کیفیت	مخالفوں کا جانی نقصان	مسلمانوں کا جانی نقصان	جنگ
عام روایتوں کے مطابق صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔	۷۰	۲۲	بدر
عام روایت کے مطابق قریش کے صرف ۲۳ افراد قتل ہوئے تھے۔	۳۰	۷۰	اُحد
عام روایت کے مطابق مخالفوں کے صرف	۱۰	۶	خندق یا احزاب

[1] اس نقشہ میں فتح مکہ کے نقصانات شامل نہیں وہ سابقہ اعداد میں شامل کر لیے گئے ہیں یعنی دو مسلمان اور گیارہ غیر مسلم۔

			چارآدمی قتل ہوئے تھے۔
خیبر	۱۸	۹۳	
موتہ	۱۲	نامعلوم	
حنین	۶	۷۱	ابن حزم نے شہدائے حنین کی تعداد چار بتائی ہے۔ (جوامع السیرۃ ص۲۴۱)
محاصرۂ طائف	۱۳	نامعلوم	
تبوک	x	x	
میزان	۱۴۷	۲۷۴	

مخالفین کے جانی نقصان میں موتہ اورطائف کے اعداد شامل نہیں ،وہ بہت زیادہ نہ ہوں گے۔ غرض تمام چھوٹی بڑی مہموں اور باقاعدہ جنگوں میں مسلمانوں اور مخالفوں کا کل جانی نقصان یہ ہوا:

مسلمان= ۱۴۷+۶ ۹=۲۴۳

مخالفین=۲۷۴+۱۸۸=۴۶۲

ان میں رجیع اور بئر معونہ کے شہدا کو شامل نہیں کیا گیا،کیونکہ وہ تبلیغ کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لئے بھیجے ہی نہیں گئے تھے اگر آپ انہیں بھی جانی نقصان میں شامل کرلیں تو پوری تعداد اناسی کے اضافے سے تین سوبتیس بن جائے گی۔ اسی طرح مخالفوں کے اعداد نقصان میں جنگ،موتہ اور محا صرہ طائف کے مقتولین

شامل نہیں کیے گئے۔ ان کے شمول سے مخالفوں کی تعداد میں بھی کسی قدر اضافہ ہوجائے گا اگرچہ وہ زیادہ سے زیادہ چند سوہی کا ہوسکتا ہے۔

قاضی صاحب مرحوم کا نقشہ

قاضی محمد سلیمان مرحوم نے پہلے غزوات وسرایا کا ایک مفصل نقشہ دیا ہے، جس میں ایک ایک مہم اور ایک ایک جنگ کے متعلق الگ الگ بتایا گیا ہے کہ فریقین کے کل کتنے آدمی شریک تھے اور ان میں سے کتنے مقتول یا شہید ، کتنے مجروح اور کتنے اسیر ہوئے۔[1] پھر انہوں نے تمام اعداد کا ایک جامع نقشہ تیار کیا جو درج ذیل ہے[2]:

فریق	شہید یا مقتول	مجروح	اسیر	میزان	کیفیت
مسلمان	۲۵۹	۱۲۷	۱	۳۸۷	قاضی صاحب مرحوم نے تصریح فرمادی کہ فریقین کے زخمیوں کی تعداد صحیح نہیں ، اسیروں

---

[1] رحمۃ اللعالمین جلد دوم (ص۲۴۴، ۲۶۴)

[2] ایضاًایضاً(ص۲۸۰)

					اور مقتولوں کی تعداد صحیح ہوگی ۔ انشاءاللہ
مخالفین	۷۵۹	۔	۶۵۶۴	۷۳۲۳	=
میزان	۱۰۱۸	۱۲۷	۶۵۶۵	۷۷۱۰	=

توجہ طلب حقیقت

خاص توجہ کی محتاج یہ حقیقت ہے کہ رمضان ۱ھ(مارچ ۶۲۳ء) سے ۹ ھ (۶۳۰ء) تک جتنی جھڑپیں ، یاکشمکشیں یا جنگیں ہوئیں ، ان میں مسلمانوں اور مخالفوں کا نقصان جانی زیادہ سے زیادہ ایک ہزار اٹھارہ نکلتا ہے اور یہ اتنا بہ حقیقت نقصان ہے کہ جب میں نے مختلف احباب سے اس کا ذکر کیا تو انھیں ابتدا میں یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ عرض کیا جارہا ہے، وہ حقیقت ہے۔ اچھا،آپ فرض کرلیں کہ یہ نقصان حقیقی کا صحیح مرقع نہیں ۔ اس عدد کو دگنا یاتگنا کر لیجیے، پھر بھی نقصان زیادہ سے زیادہ تین ہزار جانوں کا ماننا ہوگا۔ یادرہے کہ اس حساب میں ہم نے غزوات وسرایا کی نوعیتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہر جھڑپ کے نتائج یکجا کرلیے ہیں ، انھیں آٹھ سال پر پھیلا لیا جائے تو فی سال کے حساب سے پونے چار سو آدمیوں کا نقصان ہوا اور یہ ان جنگوں کا نقصان ہے جن کے نے رسول

اللہ ہ خـوا ہاں تھے اور نہ حضـور نے کسـی میں پیش دسـتی کی۔ معـاملہ محض پیغـام حـق کی تبلیغ کا تھا،جو صلح و امن کے ساتھ رزم و پیکـار سے قطـع نظـر کـرتے ہوئے برابـر جـاری رہا۔کس طـرح اور کیـونکر؟ اس کے مفصـل حـالات ہمیں معلوم نہیں ۔ یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال عـرب کی انـدرونی کشمکشـیں ختم ہوگـئیں اور تبلیغ نے پہلی منزل کامیابی سے طے کـرلی،یعـنی عـرب جـو ق درجـوق،گـروہ درگـروہ اور قـبیلہ درقـبیلہ حلقہ بگـوش اسـلام ہوگـئے، جـوو جـود اقدس حق و باطـل کی پہلی امتحـان گـا ہ یعـنی غزوہ بدر میں صرف تین سو تیرہ جانبـاز لا سـکا تھـا ، وہ تبـوک کی جـانب روانہ ہوا تـو اس کـا پرچم حق تیس ہزار سرفروشوں پر لہرارہا تھا۔ اللہ اور دین حـق کی راہ میں سـب کچھ نثـار کردینے والا اتنا بڑا لشکر پہلے عرب کی سـرزمین سے اٹھا تھا۔

کیـا حقیقتاً ہزار سـوا ہزار یـا زیـادہ سےً تین ہزار جانوں کے نقصان کے ساتھ اتنا عظیم القـدر کا رنـامہ انجـام دیـنے کی کـوئی مثـال روئے زمین کی سرگزشت کے کسی بھی حصـے سـے پیش کی جاسکتی ہے؟ اس سـر گزشـت میں ظہور اسـلام سے پیشتر کـا دور بھی شـامل ہے اور بعـد کـادور بھی، پھـریہ روشـن حقیقت بھی ہرلحـاظ سـے سامنے رہنی چاہیے کہ یہ صرف زمین کی تسـخیر نہ تھی، یہ تخت حکـومت اور سـرپر سـلطنت آراستہ کرنے کامعـاملہ نہ تھـا۔ اس دور میں ایـک

نئی قوم وجود پذیر ہوچکی تھی۔ کیسی قوم؟

قرآن مجید گواہ ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ

(آل عمران:١١٠)

“مسلمانوں !تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو عالم انسانیت کے ارشاد و اصلاح کے لیے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا حکم دینے والے برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو ۔”

ان تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں سب کچھ فرمادیا گیا، جو کسی انسانی گروہ کی مدح و ستایش میں کہا جاسکتا تھا۔ اللہ پر ایمان ،معروف کا حکم اور منکر کی روک تھام کے بعد کون سی چیز باقی رہ گئی، خواہ اس کا دائرہ کوئی ہو؟

پھر عربوں کی حالت ظہور اسلام سے پیشترکیا تھی؟ جنگل کے وحشیوں اور درندوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔تمام قبیلوں اور گروہوں کے چلن و حشیانہ تھے۔لوٹ مار کے سوا ان کا کوئی پیشہ نہ تھا۔ ان کی زندگیاں فتنہ و فساد میں کٹتی تھیں ۔ دو شخصوں میں معمولی سی بات پر جھگڑا ہوجاتا تو قبیلوں کے قبیلے اس آگ میں کود پڑتے تھے۔

قرآن مجید ہی گواہ ہے کہ اس قوم کو جو شیوہ ہائے انسانیت کے اعتبار سے شاید رُوئے زمین کی پست ترین قوم تھی، بلند ترین مسند

پر لا بٹھایا اور امامت روئے زمین کا منصب سونپ دیا:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

(آل عمران:۱۰۳)

"اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو تمہارا حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے (لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ) بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا حال تو یہ تھا کہ آگ سے بھری خندق کے کنارے کھڑے تھے (ذرا پاؤں پھسلتا اور شعلوں میں جاگرتے) اللہ نے تمہیں اس خطرناک حالت سے نکال لیا۔"

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ

(انفال: ۶۳)

"اور(اللہ ہی ہے جس نے) مومنوں کے دلوں میں باہم اُلفت پیدا کردی ، اگر تو وہ سب کچھ صرف کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے، جب بھی ان کے دلوں میں باہمی الفت نہ جوڑ سکتا یہ اللہ ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کردی۔"

اسی مختصر سی مدت میں جس میں تسخیرارض کی پہلی منزل طے ہوئی، نئی قوم معرض وجود میں آگئی۔ ایک نیا نظام بھی پوری کامیابی سے جاری ہوگیا جو روئے زمین کے

انسانوں کی تقدیریں پلٹ دینے والا تھا اور کیسی قوم؟

اگر تاریخ میں ایسی دوسری قوم کی مثال ملتی ہے تو تلاش کر لیجیے۔ اتنے معمولی سے جانی نقصان کی بناءپر جس کی حقیقی مقدور سو ا ہزار سے زیادہ نہ تھی، صرف آٹھ نو سال میں یہ سب کچھ عملی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا۔ کیا اس و جود اقدس کے "رحمتہ للعٰلمین" ہونے میں کسی کو دم بھر کے لیے تامل ہوسکتا ہے؟ لوگ معجزوں میں کلام کرتے ہیں ۔ اس سے زیادہ پُر تاثیر اور یقینی طور پر ناقابل انکار معجزہ کون سا ہوسکتا ہے؟

تصویر کا دوسرا رُخ

یہاں تقابل مقصود نہیں ، کیونکہ تقابل بہ ہر حال کسی نہ کسی مناسبت کی بناءپر کیا جاسکتا ہے اور یہاں مناسبت کا ملاً ناپید ہے۔ ہاں ، عبرت کی غرض سے کچھ اعداد و شمار ان قوموں اور ملکوں کے پیش کیے جاتے ہیں ، جو بہ زعم خویش تہذیب و شائستگی کے سدرۃ المنتہٰی پر بیٹھے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے ابتدائی دور میں انگریزوں کو اپنی اور فرانسیسیوں کی فوجیں ڈنکرک سے نکالنی پڑی تھیں تو آدمیوں کو بچالانا مقدم قرار دے دیا گیا اور بھاری سامان جنگ دشمن کے حوالے کیے بغیر چارہ نہ رہا ۔ چرچل نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ سازو

سامان جنگ مشینوں میں ڈھالا جا سکتا ہے لیکن آدمی مشینوں میں نہیں ڈھالے جا سکتے۔ تاہم آپ خوب چھان بین کرلیں کہ مہذب یورپ نے باہمی جنگوں میں اور خصوصیت سے ان جنگوں ؛ میں جو ایشیائی اور افریقی خطوں میں کی گئیں ، انسانی خون کو پانی سے بڑھ کر ارزاں بنائے رکھا یا نہیں اور یہ سلسلہ مشرق وسطیٰ یا ہند چینی میں آج بھی انتہائی بے پروائی سے جاری ہے۔ گویا وہاں انسان نہیں بستے جن کے خون کا احترام اہل مغرب میں سے کسی کے لیے قابل توجہ ہو۔

مرقع عبرت

آپ نے رحمۃٌ للعٰلمین ﷺ کی ناخواستہ جنگوں کے اعداد ملاحظہ فرمالیے، جنھیں زیادہ سے زیادہ بڑھا کر بھی آٹھ نو سال میں تین ہزار تک پہنچا یا جا سکتا ہے۔ اب داعیان تہذیب کی رزم آرائیوں کا پورا مرقع نہیں ، بلکہ اس کی صرف چند جھلکیاں دیکھ لیجیے۔

۱۔ "سی سالہ جنگ" ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ ءتک تیس سال جاری رہی، جس میں جرمنی، فرانس ، آسٹریا، سویڈن وغیرہ نے حصہ لیا۔ اس میں صرف جرمنی کے ایک کروڑ بیس لاکھ آدمی مارے گئے۔[۵]

۲۔ امریکی خانہ جنگی ۱۸۶۱ءسے ۱۸۶۵ءتک جاری رہی۔ اس میں ایک فریق شمالی ریاستیں

---

۵ Book of Facts ص ۶۱۴

اور دوسرا فریق جنوبی ریاستیں تھیں اور جنگ کا سبب غلامی کا مسئلہ تھا۔ اس میں تین لاکھ آدمی شمالی ریاستوں کے اور پانچ لاکھ جنوبی ریاستوں کے مارے گئے۔ چوہتر کروڑ پونڈ خرچ ہوئے۔ اس رقم سے دنیا بھر کے غلام ایک قطرۂ خون بہائے بغیر آزاد کرائے جا سکتے تھے۔ امریکہ میں غلامی قانوناً ختم ہوچکی ہے۔ لیکن اس کی تمام لعنتیں آج بھی وہاں مکروہ ترین صورت میں موجود ہیں ۔

۳۔ پہلی عالمی جنگ میں ایک کروڑ آدمی مارے گئے تھے اور دو کروڑ مجروح ہوئے تھے۔ خدا جانے ؛ان میں سے کتنے لُولے، لنگڑے، اندھے اور اپاہج ہوئے اور کتنوں نے ہسپتالوں میں جانیں دیں ۔ پھر اس جنگ ہی سے انفلوئنزا شروع ہُوا، جس میں مزید ایک کروڑ آدمی مرگئے ایک انسانیت دوست صاحب علم کا اندازہ ہے کہ اس جنگ پر اسی (۸۰) ارب پونڈ خرچ ہُوئے اس رقم سے فرانس اور بلجیم کی نہ صرف زمین بلکہ ہر چیز پانچ پانچ مرتبہ خریدی جا سکتی تھی۔

دوسری عالمی جنگ

۴۔ دوسری عالمی جنگ کے صرف مقتولین کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے:

چین	۲۲۴،۱۰،۱۳
فرانس	۰۰۰،۰۰،۲

جرمنی	۰۰۰،۰۰،۶۳
صرف فضائی بمباری	۰۰۰،۰۰،۵
جاپان	۷۹۵،۳۵،۵
بمباری سے	۳۰۹،۴۱،۲
یونان	۰۰۰،۱۵،۴
برطانیہ	۶۵۲،۵۳،۳

ان اعداد کی میزان قریباً ایک کروڑ بنتی ہے۔ لیکن ان میں بہت سے شرکائے جنگ کے مقتولین شامل نہیں ہیں مثلاً چیکو سلواکیا، پولینڈ، روس،فن لینڈ، یوگوسلاویا، بلغاریا، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ، پھر مختلف ملکوں کے ان گروہوں کا جانی نقصان معلوم نہ ہوسکا، جنہیں ہٹلر کی فوجیں جبری مزدوری کے لیے جرمنی لے گئی تھیں ۔ اور جنگ کے اختتام تک وہ لوگ واپس نہ ہوسکے۔ یہ تمام اعدا د جمع کیے جائیں تو دوسری عالمی جنگ کا نقصان دو کروڑ افراد سے بھی بڑھ جائے گا۔

آتش ریز اور آتش خیز بموں سے شہر، قصبے، کارخانے، کھیتیاں ، زمینیں ، گاؤں ، بندرگاہیں ، بجلی اور پانی کے مرکزجس طرح تبا ہ ہُوئے ان کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ ہیروشیما اور ناگا ساکی میں ایٹمی بموں سے جو قیامت بر پا ہُوئی، اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں ُ

ربانی سیاست اور شیطانی سیاست

رحمہ

ُ للعٰلمین ﷺ ربانی سیاست پر کار بند تھے اور اسی سیاست کو اولاد آدم کا دائمی مسلک بنادینے کا پیغام پہنچا گئے۔ جو اعداد اوپر پیش ہوچکے ہیں ، وہ ان گروہوں ، جماعتوں اور قوموں کے کارنامے ہیں ،جنھیں ربانی سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں ، ان کا مدار شیطانی سیاست ہے۔ ربانی سیاست کاپورا نظام ربانی صفات کے مرکز پر گھوم رہا ہے۔ جس میں رحمت، شفقت، رافت کار فرما ہوتی ہیں ۔ انسانوں کی مادی اور معنوی تربیت صحیح اصول پر کی جاتی ہے۔ شیطانی سیاست عالم انسانیت کے لیے شدید طوفان برق و باد یا نہایت خوفناک بھونچال کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے جزوی مظاہرے جا بجا ہوتے رہتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ تخریب در تخریب اور اعدام در اعدام کے سوا کچھ نہیں ۔

سوچیے کہ اگر نوع بشر کے ہو ش و حواس سلامت ہیں تو وہ کس سیاست کو اپنی بہتری اور بہبود کے لیے چنے گی؟ وہ سیاست جسے تھوڑی مہلت مل جائے تو روئے زمین کے بہترین خطوں کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالے اور انسانوں کی عظیم صفوں کی مہلت حیات آگ اور خون کے طوفانوں میں ڈبودے؟ انسانیت کی بہتری صرف ربانی سیاست ہے،جسے عرب کی چھوٹی جماعتیں لے کر نکلیں تو جہاں پہنچیں تاریکیوں میں اجالا کر دیا ۔ صلح و امن اور محبت و مواخات کے سلسلے قائم کر دیے اور انسانوں میں جب باری تعالیٰ، حب رسول اللہ ﷺ اور حب

انسانیت کی لگن پیدا کردی۔ آج حضوررحمۃ للعٰلمین ﷺ کے کروڑوں نام لیوا موجود ہیں مگر کہیں کوئی ایسا منظر نہیں ملتا جو قلب و روح کے لیے وجہ اطمینان یا حضور ﷺ کی ذات بابرکات سے انتساب کے پیش نظر زیبا ہو:

نہ داغ تازہ مے کارد نہ زخم
کہنہ مے خارد
بدہ یا رب دلے کایں صورت بہ
جاں نمے خواہم

عالمی اصلاح و امن کی محکم بنیادیں

آں کتاب زندہ قرآن حکیم | حکمت او لایزال است و قدیم
نوع انسان را پیام آخریں | حامل او رحمۃ اللعٰلمینؐ

عالمی اور بین الاقوامی زاویہ نگاہ

اسلام کا زاویہ نگاہ یک قلم عالمی اور بین الاقوامی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ پوری کائنات انسانیت کی ہدایت کے لیے معبوث ہوئے تھے اور حضور ﷺ نے جب تبلیغی دعوت نامے ارسال فرمائے تھے تو وہ صرف رُوسائے عرب کے لیے نہ تھے بلکہ ایران کے کسریٰ ، مشرقی روم کے قیصر، مصر کے مقوقس اور حبش کے نجاشی کے لئے بھی تھے۔ یہ ملک عرب کے اردگرد واقع تھے، ان کے ساتھ عربوں کے تجارتی روابط تھے اوروہ ان ملکوں میں جاتے آتے تھے۔یہ عالمی دعوت اسلام کی طرف پہلا قدم تھا۔مسلمانوں کا فرض تھا کہ حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ کی پیروی میں دعوت

و تبلیغ کے دائرے کوتد ریجاً وسیع تر کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ اسلام دنیا بھر میں پھیل جاتا اور رسول اللہ ﷺ جس غرض سے معبوث ہوئے تھے وہ پایہ تکمیل پر پہنچ جاتی۔ افسوس کہ تھوڑا ہی عرصہ گزرنے کے بعد ایسی حکومتیں وجود میں آگئیں ، جو وضع و ہیئت ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ بڑی حدتک معنوی اعتبار سے بھی ویسی ہی بادشاہیاں تھیں ، جیسی ظہور اسلام سے پیشتر موجود تھیں۔ کہیں کوئی اچھا فرمانروا بروئے کار آتا رہا تو اس نے اپنے ماحول کے اعتبار سے مربیا نہ سیاست کے مطابق کا م کیا لیکن فی الجملہ حالت بگڑتی گئی، یہاں تک کہ وہ بادشاہیاں بھی رفتہ رفتہ اسی حالت کو پہنچ گئیں ، جو ان کے لیے مقدر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی البتہ بعض نیک اور سعید ہستیوں نے جابجا تربیتی اور تبلیغی مرکز قائم کیے، جن کی برکات وحسنات کے ذکر کا یہ محل نہیں ۔

یہاں قرآن مجید کے چند انقلاب انگیز اصول پیش کیے جاتے ہیں ، جو عالمی صلح وامن اور خیرو بہبود کے زبردست عوامل تھے۔ تعجب ہے کہ خود مسلمان بھی ان پر ٹھیک ٹھیک عمل پیرانہ ہوسکے۔ اس حالت میں دوسروں سے عمل پیرائی کی کیا امید رکھی جاسکتی تھی۔

بین الاقوامی امن کے تقاضے

بین الاقوامی اصلاح و امن کے سلسلے میں

سب سے پہلا اور بنیادی امر یہ ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانی گروہوں ، جماعتوں اور قوموں کو اصولی اعتبار سے مساوی تسلیم کیا جائے اور اس مساوات کو عملی لباس پہنانے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی جائے۔ اگرچہ کسی کا عقیدہ کچھ ہو جو کتاب رحمۃ للعٰلمین ﷺ پر نازل ہوئی ، اس میں انسانی مساوات کا غیر مشتبہ اعلان موجود ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۱۳ (حجرات : ۱۳)

"لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنا ئے تاکہ تم پہچان لیے جاؤ ۔ یقینا تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے ، جو زیادہ متقی اور پرہیز گار ہے۔ خد ا دانا اور واقف کار ہے۔"

تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم علیسلم اور حوا علیسلم کی اولاد ہیں ۔ جس طرح ایک ماں باپ کے بچوں میں فرق وامتیاز کی کوئی وجہ نہیں ، اسی طرح تم کیوں امتیاز ات قائم کرتے ہو؟ وہ بھی ایسے جن کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں مثلاً رنگ اور نسل کا اختلاف، دولت و حشمت کا اختلاف، مختلف جغرافیائی خطوں کا اختلاف، یہ تمام اختلافات سراسر باطل اور بے اصل ہیں ، جن میں الجھ کر تم ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی دیواریں کھڑی کرتے ہو، حالانکہ تمہیں چاہیے ان سے قطع

نظر کرتے ہوئے بنیادی یکسانی اور یکجہتی کو مرکز توجہ بناؤ یعنی تم سب انسان ہو۔

حضورﷺ نے فتح مکہ کے بعد حرم پاک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا ان میں مخاطب وہ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اکیس برس تک ظلم و تعدی کا کوئی بڑے سے بڑا طوفان بپا کرنے میں کسر نہیں اٹھا ر کھی تھی اور شاید ہی کوئی ایسا چہرا ہو، جو مخاطبین کی برچھیوں ، تلواروں اور تیروں سے جراحت زار نہیں بن چکا تھا۔ تاہم حضور ﷺ نے فرمایا آج تم پر کوئی الزام نہیں اور تم سب آزاد ہو۔

نیز فرمایا: اے قریش ! جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدانے مٹادیا ۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ پھر سورہ حجرات کی یہی چودھویں آیت تلاوت فرمائی جو اوپر منقول ہے۔ اس سے مزید توثیق ہوگئی کہ یہ آیت مساوات انسانی کی بنیاد ہے۔

واضح رہے کہ اسے وقتاً فوقتاً پڑھ دینا کافی نہیں ، اس پر اسی طرح عمل ہونا چاہیے ، جس سے مطلوب مساوات کی تکمیل ہو۔ تمام قوموں اور گرو ہوں کے درمیان ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے رشتے استوار ہوتے جائیں ۔ امن عالم ایک حقیقت ثابتہ کی شکل اختیار کرلے۔ ایسا ہی ماحول پیغام حق کی اشاعت کے لیے بہ حیثیت مجموعی سازگار ہوگا۔ توپوں کے آتشیں گولوں یا طیاروں کی تباہی خیز بمباریوں کو پیغام پہنچانے اور حضور ﷺ کے منصب اصلاح انسانیت کو

لباس عمل پہنا نہ کااچھا ذریعہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

اکثریت کی بنیاد

پھر دیکھیے، اس آیہ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسانوں کی عزت و اکرمیت کی بنیاد دولت ، رنگ ، خون ، نسل، قوم یا کوئی خاص جغرافیائی خطہ نہیں صرف تقویٰ اور حسن عمل ہے۔ ہر انسان اس بنا پر عزت کا مستحق نہیں سمجھا جاسکتا کہ کروڑ پتی یا ارب پتی ہے، اس کا رنگ گورا ہے، اس کا تعلق آریائی نسل سے ہے جیسا کہ روئے زمین کے بعض فاتر العقل گروہ سمجھ رہے ہیں اور ان میں چھوت چھات کوئی نہ کوئی شدید افتراق انگیز شکل اختیار کیے ہوئے موجود ہے۔ صرف نیک عملی انسانی اکرمیت کی اساس ہے ۔ اس باب میں سکندروں اور نپولینوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ موجدوں ، فلسفیوں ، سیاست دانوں ، عالموں اور خطیبوں کو ان کے محض پیشوں اور مشغولیتوں کے اعتبار سے بھی لایق توجہ نہیں سمجھاجاتا۔ وہاں محض نکو کاری، راست بازی، حق پرستی اورخلق دوستی درکار ہے۔ اس کے سوا ہر سکۂ عمل کھوٹا اور ہرسرگرمی کاربے حقیقت ہے۔

اس کی حقیقت پر آپ نے غور فرمایا؟ اس دنیامیں حسن عمل کے سوا ہر معیار عظمت حسد، رقابت اور کشمکش کا موجب ہوتا ہے۔

دولت کو معیار بنایا جائے تو جسے جائز ذریعے سے حاصل نہ ہوگی، وہ ہرناجائز ذریعے سے حاصل کرے گا اور خلق خدا کے لیے لعنت بن جائے گا۔ فن حسب و سیاست میں کمال کو معیار بنایا جائے گا تو مختلف لوگ روئے زمین کو انسانوں کے خون سے رنگنے میں اپنی زندگیاں تمام کردیں گے اور دنیا ان کو صرف نفرین کا مستوجب ٹھہرائے گی لیکن حسن عمل میں رقابت یا حسد راہ ہی نہیں پاسکتے کیونکہ وہ منافی حُسنِ عمل ہوں گے۔ یوں تمام انسانوں کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ حسنِ عمل کی فراوانی سے روئے زمین امن و سلامتی کا بہشت زار بن جائے۔

دین میں کوئی جبر نہیں

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ٭ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۲۵۶ۚ (بقرہ:۲۵۶)

"دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں ، بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہوگئی ہے۔ پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کردے (یعنی سرکشی، فساداور گمراہی سے یک قلم بیزار ہوجائے) اوراللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے فلاح و سعادت کی مضبوط ٹہنی پکڑلی جو ٹوٹنے والی نہیں (جس کے ہاتھ آگئی وہ گرنے سے محفوظ ہوگیا) اور یاد رکھو اللہ سب کچھ سننے

اور جاننے والا ہے۔”

انسانی ظلم و ستم کے جوخو نچکاں واقعات تاریخ کے صفحات پر منقوش ہیں ، ان میں سے تین چوتھائی واقعات صرف جبر و تشدد کا نتیجہ ہیں ، جو ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے بے دریغ روا رکھے ۔ اگرچہ یہ حقیقت ہر سلیم العقل انسان پر،روز روشن کی طرح آشکارا تھی کہ دین کی راہ دل کے اعتقاد ویقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت وموعظت ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ جبرواستکراہ سے انسانی جسم کو اپنی مرضی کے مطابق جھکایا جا سکتا ہے، مگر دل میں اعتقاد و ایمان کا چراغ روشن نہیں کیا جا سکتا اور جب تک چراغ یقین روشن نہ ہوگا ، وہ اعمال ظہور پذیر نہیں ہو سکتے، جو ازروئے دین مطلوب و منظور ہیں بلکہ جبر سے دلوں میں نفرت و کراہت کی آگ مشتعل ہوگی اور جب جابر قوت میں ضعف آئے گا تو رد عمل کو کوئی طاقت روک نہ سکے گی اورو ہی صورت حال نمودار ہوجائے گی جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے:

كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا (نحل:۹۲)

“اس عورت کی مثال ،جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔”

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن کے فوائد میں اس آیت کے متعلق لکھا گیا ہے:

جب دلائل توحید بخوبی بیان فرما دی گئیں ،جس سے کا فر کا کوئی عذر باقی نہ رہا

تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہوسکتی ہے؟ عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بنا ؤ ۔ ⁽¹⁾

پھر اس آیت کے مطالب کی توثیق بعض دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔مثلاً

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُکْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

(یونس:۹۹)

"اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں ،وہ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تو ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاؤ میں چھوڑ نے والا نہیں ؟"

اس آیہ مبارکہ سے ایک طرف یہ نمایاں ہے کہ مخلوق کی ہدایت کے لیے رسول اللہ کے قلب مبارک کی تڑپ کا کیا عالم تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ اس معاملہ میں جبر کی کوئی گنجایش نہیں ۔ اللہ کی مشیت یہی ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں خود سوچ سمجھ کر اس طرف متوجہ ہوں اور بقدراستعداد سعادت کی منزلیں طے کریں ۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں :

آپ کو (رسول اللہ ﷺ کو) یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتاردیں ۔ خدا چاہتا تو بے شک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا‘ مگر ایسا کرنا اس کی تکوینی

⁽¹⁾ قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ص ۵۴ حاشیہ

حکمت و مصلحت کے خلاف تھا ، اس لیے نہیں کیا گیا۔[1]

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ (کہف:۲۶)

"(اے پیغمبر) کہہ دو، یہ سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے اب جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں چاروں طرف سے انہیں گھیرلیں گی۔ "

غرض جس طرح مساوات کا اعلان شرف انسانی کے اعتراف کا ایک جزو ہے، اسی طرح عقیدے و ایمان کے سلسلے میں جبر کی نفی بھی انسانی شرف ہی کاذریعہ ہے،لیکن اسلام ہر انسان میں جہاں اشرفیت کا زیادہ سے زیادہ گہرا احساس پیداکرنا چاہتاہے،وہاں یہ توقع بھی رکھتا ہے(اور رکھنی چاہیے) کہ انسان اپنے شرف ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسن عمل کا مصدر بنیں گے اور خدا پران کا ایمان زیادہ سے زیادہ مستحکم و استوار ہوگا کیونکہ اشرفیت کا احساس سلیم العقل انسان کو کسی اور طرف لے جا ہی نہیں سکتا۔

عدل پر استواری

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

---

[1] قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ۲۴۸۔۲۸۵ حاشیہ

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ (مائدہ:۸)

"اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کو مضبوطی سے کھڑے ہو جایا کرو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ اس سے انصاف نہ کرو (ہر حال میں) انصاف کرو یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو اللہ کو خوب خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو"

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن میں ہے کہ قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ میں حقوق اللہ کی طرف اور " شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ " میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے:

"عدل" کا مطلب ہے کسی کے ساتھ بدونِ افراط و تفریط وہ معاملہ کرنا، جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلے کو جھکانہ سکے معلوم ہوتا ہے کہ "عدل و قسط" یعنی دوست دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملہ میں جذبات محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا، یہ فضیلت حصول تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین انصاف میں سے ہے۔[۵]

---

۵ قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ص ۱۴۰ حاشیہ

ہر سلیم العقل انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ اسلام کن خصوصیات والے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کسی فرد یا جماعت سے کتنی ہی عمیق محبت یا کتنی ہی شدید دشمنی ہو، جب گواہی دینے کا مرحلہ سامنے آئے گا، مسلمان کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے گا، جو حق و انصاف کے عین مطابق نہ ہو۔

یاد ہوگا کہ فتح خیبر کے بعد وہاں کی زمین نصف پیدا وار کی بنا پر یہودیوں کے حوالے کردی گئی تھی۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ کو بٹائی کے لیے بھیجا جا تا تھا۔ وہ پیدا وار کو دو حصوں میں تقسیم کرکے دو انبار لگوادیتے اور یہودیوں سے کہتے کہ جو حصہ چاہو، اٹھالو۔ یہودی کہتے: "زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں ۔" مسلمانوں کا وظیفۂ حیات روئے زمین پر یہی تھا اور ایسے ہی اصول حیات عالمی امن کے ضامن ہوسکتے ہیں ۔ وہ افراد یا گروہ اس وظیفہ کی بجا آوری سے کیونکر عہدہ بر آہوسکتے ہیں ، جن کی زبانوں سے الفاظ نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، پُھول جھڑ رہے ہیں لیکن ان کے دل ، ان کی طبیعتیں اور ان کی ذہنیتیں نہایت پست اور امن بر انداز اغراض سے یک قلم آلودہ ہیں ۔ یہ وہی شیوہ ہے جس پر مدینہ منورہ کے یہودی عربوں کے تعلق میں کار بند تھے اور کہا کرتے تھے:

لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ (آل عمران:۷۵)

"امیوں (یعنی عربوں) کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ہم پر کچھ مواخذہ نہیں (یعنی ان کے ساتھ دیانت داری برتنا ضروری نہیں) اور یہ کہہ کر وہ اللہ پر تہمت باندھتے ہیں حالانکہ اچھی طرح جانتے ہیں حقیقت حال کیا ہے؟"

یعنی جس گروہ سے ذاتی اغراض وابستہ ہیں ،ان کے متعلق ایک نظام اخلاق اور ایک ضابطہ نیک و بد ہے لیکن جن سے کوئی خاص علاقہ نہیں ،ان کے باب میں بالکل دوسری روش اور دوسرے اصول پیش کیے جاتے ہیں ۔

نیکی میں تعاون بدی سے گریز

قرآن نے ایک انقلاب انگیز اصول مندرجہ ذیل آیت میں پیش کیا ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲﴾ (مائدہ:۲)

"جس گروہ نے تمہیں مسجد حرام سے روک دیا تھا،اس کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھار دے کہ اس کے ساتھ زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستورالعمل تو یہ ہونا چاہیے کہ) نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو،گناہ اور ظلم کی کسی بات میں تعاون نہ کرو اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو وہ(پاداش عمل میں)سخت عذاب دینے ولا ہے۔"

قریش مکہ نے حدیبیہ میں مسلمانوں کو ادائے عمرہ سے روک دیا تھا،جب اختیار کی باگ ڈور

مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی تو انہیں پر یہ واضح کر دینا ضروری تھا کہ قریش کی سابقہ زیادتی تمہارے لیے زیادتی کاموجب نہ بن جائے۔اگرچہ تمہارے خیال کے مطابق وہ ان کی زیادتی کا جواب ہی ہو۔ مسلمان کا دستورالعمل یہ ہے کہ جہاں نیکی اور اچھائی دیکھتا ہے،اس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ بر و تقویٰ زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں ۔البتہ ظلم و گناہ سے دور رہنا لازم ہے۔انہیں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نہ دینا چاہیے۔

انسان اور راستبازی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ (نسا:۱۳۵)

“اے ایمان والو!تم انتہائی مضبوطی اور پختگی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے ہو جاؤ کہ اگر وہ گواہی خود تمہارے خلاف یا تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے بھی خلاف ہو تو ہرگز نہ جھجکو۔اگر کوئی مالدار یا مفلس ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان پر مہربانی رکھنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہوا و نفس کی پیروی تمہیں انصاف سے باز رکھے۔اگر تم (گواہی دیتے وقت) بات کو گھما پھرا کر پیش

کرو گے یا گواہی دینے سے پہلو بچا جاؤ گے تو(یاد رکھو) اللہ تمہارے کاموں سے پوری طرح آگاہ ہے۔”

انسا ن کے لیے ایک اہم مرحلہ یہ ہے کہ وہ ہرحال میں سچ پر قایم واستوار رہے اور سچی گواہی دینے میں ذرا بھی پس وپیش نہ کرے،اگرچہ سچ بولنے سے خود اسے یا اس کے والدین اور قرابت داروں کو نقصان پہنچے۔یہ بھی ممکن ہے کسی کو مالدار کے مال کا لالچ یا اثر و رسوخ کا خوف سچ کہنے سے تمہیں باز رکھے یا کوئی مفلس ہو جس کی مفلسی پر ترس کھاکر تھوڑی سی غلط بیانی گوارا کرلی جائے۔ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی مالدار ہو یا غریب،اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان کے لیے گواہی دینے والے سے کہیں زیادہ سود مند اور نفع بخش ہوگی۔غرض انصاف کے معاملے میں ہوائے نفس کی پیروی ہر گز نہ کرنی چاہیے۔یہ بھی نہیں کہ بیان میں ہیر پھیر کا طریقہ اختیا ر کیا جائے یا گواہی نہ دینے ہی سے گریز کو پناہ گاہ بنالیا جائے۔ اس طرح انسانوں کوچکما دیا جاسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دلوں اور نیتوں کے بھید بھی جانتا ہے۔جو لوگ اپنے خلاف یا اپنے انتہائی قریبی رشتے داروں کے خلاف بھی سچ کہتے ہوئے نہ جھجکیں ،وہ مخلوق کی بھلائی اور بہبود کے لیے جو گراں بہا کام انجام دے سکتے ہیں ،ان کی توقع ایسے لوگوں سے کیونکر رکھی جاسکتی ہے جو ایک لفظ زبان سے نکالتے وقت دس مرتبہ

سوچتے ہیں کہ اس سے ہمارے موافقوں پر تو زد نہ پڑے گی اور ہمارے مخالف تو فائدہ نہ اٹھالیں گے اس کا نام ان کے ہاں "سیاستدانی" اور "تدبر" ہے۔ امن عالم کے ضامن وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو حق و انصاف کے معاملے میں راست بازی کے اس انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہوں ۔

برائی کے جواب میں بھلائی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۳۴ (حم سجدہ:۳۴)

"اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہے(بدی کو) اس طریق سے دور کر جو اچھا ہے(یعنی نیکی کے ذریعے سے) پھر تم دیکھو کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان دشمنی ہے وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے گا۔"

حضرت شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن مجید کے فوائد میں ہے:

خوب سمجھ لو بدی نیکی اور نیکی بدی کے برابر نہیں ہوسکتی،دونوں کی تاثیر جداگانہ ہے۔ بلکہ ایک نیکی دوسری نیکی سے اور ایک بدی دوسری بدی سے اثر میں بڑھ کر ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک مومن قانت خصوصاً ایک داعی الی اللہ کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ برائی کا جواب برائی سے نہ دے بلکہ جہاں تک گنجائش ہو برائی کے

مقابلے میں بھلائی سے پیش آئے ۔ اگر کوئی اسے سخت بات کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے مقابل وہ طرز عمل اختیار کرنا چاہیے جو اس سے بہتر ہو اس طرز عمل کے مقابلے میں تم دیکھ لو گے سخت سے سخت دشمن بھی ڈھیلا پڑ جائے گا اورجو دل سے دوست نہ بنے تا ہم ایک وقت آئے گا جب وہ ظاہرمیں ایک گہرے اور گرم جوش دوست کی طرح تم سے برتاؤ کرنے لگے گا بلکہ ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد سچے دل سے دوست بن جائے۔

غرض یہ اصول ایسا ہے کہ ہر ہمتور اور مخلص انسان اس پر عمل پیرا ہوسکتا ہے۔ پھر مسلمان تو حقیقتاً ایک مستقل داعی الی اللہ ہے۔مزید بر آں خود رسول اللہ ﷺکا دستور یہی رہا اور حضورﷺ کی پیروی سے بڑھ کر کسی کے لیے راہ سعادت کیا ہوسکتی ہے؟

عدل و احسان

قرآن مجید کی ایک اور جامع انقلابی دعوت پر غور فرمائیے، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالاِحْسَانِ وَ اِیْتَآیٔ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَ الْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾ (نحل:۹۰)

"اللہ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملے میں) انصاف کرو،(سب کے ساتھ) بھلائی سے پیش آؤ، قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرو اور تمہیں روکتا ہے بے حیائی کی باتوں سے، ہر طرح کی برائیوں سے

اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے۔وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ(سمجھو) اور نصیحت پکڑو۔”

اللہ کا فرمان مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ عدل کو اپنا شیوہ بناؤ،نیک کر داری میں سرگرم رہو۔ قرابت والوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔فحش کاموں سے بچو،ہر طرح کی برائیوں سے اجتناب کرو ۔ظلم و زیادتی سے کبھی آلودہ نہ ہو۔

جو لوگ مسلمان ہوچکے تھے،ان کے لیے اب آزمایش عقاید میں نہ تھی،اعمال میں تھی ۔ اس لیے اس آیت میں عملی زندگی کی تمام مہمات بیان کردیں اسی لیے مفسرین نے اسے جوامع آیات میں شمار کیا ہے۔

عدل ،تما م محاسن اعمال کی اصل ہے۔جس انسان کے اندریہ بات پیدا ہوگئی کہ جو بات کرنی چاہیے انصاف کے ساتھ کرنی چاہیے،اس نے سب کچھ پالیا۔ احسان سے یہاں مقصود حسن و عمل ہے۔جو بات کرو‘ حسن و خوبی کی کرو ۔نیکی اور بھلائی کی کرو یعنی بنیاد عمل بھلائی ہو،برائی نہ ہوجو ہم سے قریب کا رشتہ رکھتے ہیں ،وہ ہمارے حسن سلوک کے زیادہ حقدار ہیں ،اس لیے ایتا ئی ذی القربیٰ کی رعایت بھی ضروری ہوئی۔ پھر فحشا،منکر اور بغی سے روک کر نواہی کے سارے مقاصد پورے کردیے۔ فحش سے مقصود وہ برائیاں ہیں جو حد درجہ کی برائیاں تسلیم کرلی گئی ہیں ،منکر میں ہر طرح اور ہر قسم و درجہ کی برائیاں آگئیں ۔ بغی میں ہر طرح کی زیا دتی آگئی، خواہ کسی گوشہ اور کسی شکل میں کی

گئی ہو۔

جو کتاب ایسے سانچے لے کر آئی ہو،جس سے ایسے اعمال ڈ ھلتے ہوں ،جو ایسی زندگیاں بناتی ہو،اگر وہ ہدایت،رحمت اور بشارت نہیں تو اسے اور کس نام سے پکارا جاسکتا ہے؟

یہ بالکل درست ہے جس شخص کو نیکی،بدی اور اچھائی برائی کا کچھ بھی احساس و شعور ہواور وہ دنیا کو بہتر سے بہترحالت میں دیکھنے کا واقعی آرزو مندہو،اسے ان باتوں سے ایک لمحے کے لیے بھی اختلاف نہیں ہوسکتاہے کیونکہ حقیقی اور پائیدارفلاح کی راہ وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دے رہا ہے اور اس کا صحیح اندازہ ہر انسان کو محض تدبر و تفکرصحیح سے ہوسکتا ہے،اگرچہ وہ اسلام کامعتقد نہ ہو۔ساتھ ہی یہ حقیقت بھی تو نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ جس وجوداقدس کو اس تعلیم و دعوت کااکمل و اتم پیکر بنا کر ہدایت عالم کے لیے مبعوث فرما یاگیاہے اس کے "رحمۃ اللعٰلمین" ہونے میں کسی کے لیے کیا گنجائش کلام باقی رہ سکتی؟ قرآن یقیناً "ذکرا للعٰلمین" ہے اور حضور ﷺ لاریب "رحمۃ اللعٰلمین" ہیں ۔

عہد ماضی کے مناقشات

دنیا کا بڑا حصہ عہد ماضی کے مناقشات میں الجھا ہوا ہے۔جھگڑے جاری ہیں ، بحثوں کی گرم بازاری ہے حالانکہ جس دورپر سیکڑوں یا ہزاروں سال بیت چکے ان کے متعلق آج کوئی فیصلہ ہو

بھی جائے تو گزشتہ حالات کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ۔

سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ایک مکالمے کا مختصر سا ذکر ہے۔فرعون نے سوال کیا کہ موسیٰ علیہ السلام! تمہارا پروردگار کون ہے؟ جواب ملا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو اسکی خلقت بخشی،پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ کھول دی۔ فرعون کو خیال آیا کہ بے شمار گروہ گزر چکے ہیں ،جو ایسے پروردگار کے معتقد نہ تھے۔ چنانچہ سوال کیا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہونا ہے،جو گزرچکے اور ایسے پروردگار کے تصور سے بھی نا آشنا تھے ؟ حضرت موسیٰ نے جواب دیا:

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ (طٰہٰ:۵۲)

“اس کا علم میرے پروردگار کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑجائے۔”

یعنی اس کاوش میں پڑنے اور بحث و نزاع میں الجھنے سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ بہتر ہے کہ گزرے ہوئے لوگوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑدیں اور اپنی توجہ صرف ذاتی درستی پر جمادیں ، کیونکہ نہ پہلوں کی گمراہیاں ہمیں کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان کی نیکیوں سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ ہمارا اچھا یا برا انجام ہمارے ہی اچھے یا برے اعمال کی بناؤ پر ہوگا ، پھر کیوں انہی کی فکر نہ کریں ؟ قرآن

مجید نے یہی اصول دوسرے مقام پر ان الفاظ میں پیش کیا:

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَہَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُم مَّا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا کَانُوا یَعْمَلُونَ ﴿۱۳۴﴾ (بقرہ: ۱۳۴)

“یہ ایک امت تھی ،جو گزرچکی،اس کے لیے وہ تھا ،جو اس نے اپنے عمل سے کمایا،تمہارے لیے وہ ہوگا جو تم اپنے عمل سے کماؤ گے، تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ان کے (یعنی گزری ہوئی قوموں اور جماعتوں کے)،اعمال کیسے تھے؟”

کتنا پاکیزہ اور امن پرور اصول ہے، جو ہمارے بے شمار جھگڑوں اور بحثوں کو ختم کر سکتا ہے۔ جب یہ مسلم ہے کہ نہ گزرے ہوئے لوگوں کی نیکیاں ہمارے بحثوں سے کم یا زیادہ ہوجائیں گی اور نہ ان کی بُرائیوں میں ہمارے جھگڑوں کی وجہ سے کوئی فرق پڑے گا، آخر ان بحثوں سے اس کے سوا کیا حاصل ہوسکتا کہ اپنا وقت بیجا صرف کریں ، باہمی روابط کو بگاڑیں حالا ں کہ ہماری یہ گرم جوشیاں نہ خود ہمارے نامہ اعمال میں کوئی اچھا اضافہ کرتی ہیں ، نہ گزرے ہوئے لوگوں کے لیے کسی بھی درجے میں مفید و سود مند ہیں ۔ اگر دنیا اس اصول کو اپنا لے تو غورکیجیے کہ اس کی ناخوشگوار اور بے نتیجہ سرگرمیوں میں کتنی کمی آجائے اور تعاون و خوشگوار ی کی فضا کتنی اچھی ہوجائے؟

بھائیوں کے درمیان مصالحت

قرآن مجید کا ایک اصول یہ ہے:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا
فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىہُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ
حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰہِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا
بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۹
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَ اتَّقُوا
اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۱۰ (حجرات: ۹۔۱۰)

“اور اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ پس اگر ان میں سے ایک زیادتی پر تلا رہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کا مرتکب ہو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پس اگر وہ لوٹ آئے تو دونوں فریقوں کے درمیان عدل کے مطابق صلح کر ادو اور انصاف پر استوار رہو۔ یقینا اللہ کو پسند آتے ہیں انصاف کرنے والے ۔ مومن باہم بھائی بھائی ہیں ۔ پس اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔”

دیکھیے، قتل و خونریزی کو روکنے کی کتنی عمدہ، منصفانہ اور مؤثرعملی تدبیر ہے۔ ممکن ہے دو بھائیوں کے درمیان غلط فہمی کی بناءپر کشمکش کی نوبت آجائے تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کا فرض ہے کہ ان میں صلح کرادیں ۔ اگر کوئی فریق صلح سے انکار کرے یا زوروقوت کے بل پر دوسرے فریق کو پامال کردینے پر تُل جائے تو سب کا فرض ہے کہ متحد

ہوکر مظلوم کی حفاظت کے لیے کھڑے ہوجائیں اور ظالم کو رُک جانے پر مجبورکردیں ۔ جب زیادتی کرنے وا لا بھی صلح پر آمادہ ہوجائے تو بیچ بچاؤ کرنے والوں کا فرض ہے کہ صلح کرادیں مگر وہ صلح عدل و انصاف کی بنا پر ہونی چاہیے ۔ ایسا نہ ہوکہ بعض لوگ قوی اور زبردست فریق کی کوئی با ت اس بنا، پر قبول کرلیں کہ وہ زبردست ہے حالانکہ وہ بات عدل کے خلاف ہو۔

حضورﷺ کاا رشاد ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم ۔ عرض کیا گیا کہ مظلوم کی مدد تو کی جاسکتی ہے ظالم کی مدد کیونکر ہوگی؟ فرمایا: اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے روکو۔

یہ اصول مسلمانوں کے تعلق میں بیان ہُوا، لیکن یہی اصول دنیا کے ہر بین الاقوامی ادارے کا ایک بنیادی اصول بن سکتا ہے اور جس حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے، انجمن اقوام متحدہ کا پورا نظام اسی پر قائم ہے، اگرچہ مختلف اقوام یا حکومتوں نے ذاتی اغراض کی وجہ سے اس پر عدل و انصاف کے ساتھ عملی پیر اہونے کی صحیح صورت پیدا نہیں ہونے دی۔ ذاتی اغراض ہی کی آلودگی اب تک انجمن اقوام متحدہ کی کمزوری اور بے اثری کا باعث ثابت ہوئی ہے۔ قرآن مجید کے اس اصول سے جتنا انحراف کیا جائے گایا اس پر عمل کی زیادہ سے زیادہ اچھی صورت اختیار کرنے میں جتنا تامل ہوگا، اتنا ہی

امن عالم میں اختلال کا دروازہ کھلا رہے گا۔

موجبات اختلال کا انسداد

پھر قرآن مجید نے قوموں کے خوشگوار تعلقات میں خلل ڈالنے والا ایک ایک رخنہ بند کیا۔ مثلاً:

۱۔ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ (حجرات: ۱۱)

"ہنسی نہ اڑائیں ایک قوم کے لوگ دوسری قوم کے لوگوں کی شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔"

۲۔ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (حجرات: ۱۱)

"عیب نہ لگاؤ ایک دوسرے کو۔"

۳۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۔(حجرات: ۱۱)

"چڑانے کی غرض سے ایک دوسرے کے نام نہ رکھو۔"

۴۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (حجرات: ۱۲)

"اے ایمان والے لوگو! بہت بدگمانیوں سے اجتناب کرو ، کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں ۔"

۵۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۶ (حجرات: ۶)

"اے ایمان والے لوگو! اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس خبر لائے تو (اسے صحیح سمجھنے سے پیشتر) تحقیق کرلیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ (خبر سنتے ہی) تم نادانی سے دوسری قوم پر جا پڑو۔ پھر کل اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔"

آخری گذارش

یہ صرف چند اصول بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں ، جن سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا زاویہ نگاہ عالمی اور بین الاقوامی ہے۔ ساتھ ہی بین الاقوامی ادارہ ہائے امن و سلامتی کے بنیادی اصول بھی سامنے آجاتے ہیں اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ ایسے اداروں کو زیادہ سے زیادہ مؤثرو کامیاب بنانے کے لیے کن کن اوصاف و خصا ئص کی اشد ضرورت ہے ۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ان اوصاف و خصائص کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کئے بغیر کوئی اجتماعی ادارہ خصوصًا بین الاقوامی ادارہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔

تمت بالخیر